Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱۶ اپریل ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۸

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمود الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ ۔ ۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱ ۔ ۹۲)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

بھارت اور یورپ میں پنپتی تجارتی رفاقت

ایک زمانے سے بھارتی قیادت اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ امریکا کے ساتھ ساتھ یورپی یونین سے بھی غیر معمولی تجارتی شراکت داری قائم کرے اور اس کا حجم اِتنا ہو کہ طے کرنا مشکل ہو جائے کہ امریکا بڑا تجارتی پارٹنر ہے یا یورپی یونین۔ امریکا اور یورپی یونین کو بھی اس بات کا بخوبی علم ہے کہ بھارت بیک وقت کئی کشتیوں میں پیر رکھے سفر کرتا ہے۔ ایک طرف وہ مغربی طاقتوں کی ہم نوائی کرتا ہے اور دوسری طرف اُسے روس اور چین سے بھی اپنی تجارت داؤ پر لگانے کا کوئی شوق نہیں۔ چین اور بھارت کے درمیان تجارت بہت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے اور کچھ ایسا ہی معاملہ روس کا بھی ہے۔ یوکرین جنگ کے باوجود بھارت نے روس کو ناراض نہیں کیا اور دوسری طرف یوکرین کو بھی آسرا دیا ہے کہ اُس کا کوئی حقیقی ہمدرد ہے تو بس بھارت اور اُس کے عوام ہیں۔

یورپی یونین کے لیے بھی بہت سی مشکلات محض موجود نہیں ہیں بلکہ پنپ بھی رہی ہیں۔ امریکا کی پالیسیوں میں پائے جانے والے عدمِ تسلسل کے باعث یورپی یونین کے ارکان کو بھی فکر لاحق ہے کہ کسی نہ کسی طور ہر معاملے میں امریکا پر انحصار کرنے کی پالیسی سے گریز کیا جائے اور ایسے تجارتی شراکت دار تلاش کیے جائیں جن کی مدد سے معیشتوں کو مضبوط رکھنا ممکن اور آسان ہو سکے۔ یورپی یونین کے ارکان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ امریکا کے ساتھ ساتھ رہنے میں ہمیشہ فائدہ نہیں، کبھی کبھی بہت بڑے خسارے کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ یورپی یونین کے ارکان دنیا بھر میں مضبوط تجارتی شراکت دار تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی پالیسیوں میں لچک بھی کم ہے اور تیقن کا بھی فقدان ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ وہ کب کون سا قدم اٹھائیں، کون سا ''یوٹرن'' لے لیں۔ ایسے میں یورپی یونین کو ایسے حلیف درکار ہیں جن پر بھروسا کیا جا سکے اور جن سے طویل المیعاد رفاقت یقینی بنائی جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ یورپی یونین کے ارکان چین پر انحصار بھی گھٹانا چاہتے ہیں۔ چین نے یورپی منڈی میں قدم جما رکھے ہیں مگر ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت سی چیزیں اتنی کم قیمت پر فراہم کرتا ہے کہ یورپی مینوفیکچررز کے لیے مقابلہ ناممکن سا ہو جاتا ہے۔

اِس وقت امریکا اور یورپی یونین، دونوں ہی بھارت کے سب سے بڑے تجارتی پارٹنر ہیں۔ یورپی یونین نے اپنی مارکیٹ میں بھارتی رسائی کی توسیع کر دی ہے۔ اس وقت بھارت کی مجموعی تجارت (۱۲۴؍ارب یورو) کا ۱۲٫۲؍فیصد یورپی یونین سے ہے۔ یہ حقیقت بھارتی قیادت کے لیے بہت حوصلہ افزا اور خوش کُن ہے۔ مودی سرکار نے یورپی یونین کی مجموعی مارکیٹ میں قدم اور مضبوطی سے جمانے کے لیے بہت سے اقدامات کیے ہیں۔ ٹیرف کے معاملات کو سنجیدگی سے درست کرنے پر توجہ دی گئی ہے۔

بھارتی مصنوعات کے لیے ویسے تو دنیا بھر میں منڈیاں موجود ہیں مگر امریکا اور یورپی یونین سب سے بڑی منڈیاں ہیں۔ بھارت کی برآمدات میں یورپی یونین کا حصہ ۱۷٫۵؍فیصد ہے جبکہ امریکا کے لیے یہ حصہ ۱۷٫۶؍فیصد ہے۔ چین کا حصہ ۳٫۷؍فیصد تک ہے۔

بھارت اس وقت یورپی یونین کا نواں سب سے بڑا تجارتی شراکت دار ہے۔ یورپ جو مصنوعات درآمد کرتا ہے، اُن کا ۲٫۲؍فیصد بھارت سے آتا ہے۔ امریکا کی درآمدات میں بھارت کا حصہ ۱۶٫۷؍فیصد، چین کا ۱۴٫۶؍فیصد اور برطانیہ کا ۱۰٫۱؍فیصد ہے۔

بھارت چاہتا ہے کہ یورپی یونین کے لیے اُس کی برآمدات اِس قدر ہو جائیں کہ وہ اس خطے کا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار بن جائے۔ یہی سبب ہے کہ بھارتی قیادت یورپی یونین کے ارکان کو زیادہ سے زیادہ متوجہ کرنے کے لیے بھرپور اقدامات کر رہی ہے، پالیسیاں بدل رہی ہے، مختلف معاملات میں رعایتیں بھی دی جا رہی ہیں، یورپی اداروں کو بھارت میں کام کرنے کی دعوت بھی دے رہی ہے کہ تجارتی تعلقات کی سطح معقول اور اطمینان بخش حد تک بلند کی جا سکے۔ اِن کوششوں کے نتیجے میں ایک عشرے کے دوران اشیا کی شکل میں یورپی یونین اور بھارت کے درمیان تجارت میں ۹۰ فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔

بھارت اور یورپی یونین نے خدمات کی شکل میں بھی کاروباری اشتراکِ عمل بڑھانے پر تیزی سے اور معقول حد تک توجہ دی ہے۔ فریقین خدمات کے شعبے کو بھی آگے بڑھانا

اندرونی صفحات پر

- ٹرمپ کا ٹیرف بلنڈر
- برطانیہ: سچ سمجھنا اور بولنا پڑے گا
- بھارت کا نیا وقف قانون
- مائیکروسافٹ کو اصل چہرہ دکھانے والی توانا آواز
- غزہ جنگ کون جیتے گا؟
- بھارتی معیشت: سبیر بھاٹیہ کی کھری کھری باتیں
- پروفیسر خورشید احمد مرحوم

چاہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ۲۰۲۰ء میں خدمات کے شعبے میں فریقین کے درمیان تجارت ۳۰؍ارب ۴۰ کروڑ یوروتھی اور ۲۰۲۳ء میں ۵۹؍ارب ۷۰ کروڑ یورو ہوگئی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فریقین میں ایک دوسرے پر بھروسا کس قدر ہے اور وہ کس قدر تیزی سے تجارتی تعلقات کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ یورپی ادارے بھارت میں سرمایہ کاری کے ساتھ ساتھ اپنے پلانٹ لگانے پر بھی توجہ دے رہے ہیں۔ یورپ کے مالیاتی اداروں نے بھارت سے اشتراکِ عمل تیز کردیا ہے۔ بھارت اور یورپی یونین کے درمیان تجارت کے حوالے سے تیزی سے پنپتے ہوئے اعتماد کی فضا امریکا اور چین دونوں ہی کے لیے انتہائی پریشان کن ہوسکتی ہے۔ بھارت بڑا مینوفیکچرر ہے۔ اگر یورپی یونین کا اُس پر ایسا ہی بھروسا قائم رہا تو چین جیسے بڑے مینوفیکچرر کے لیے بھی مسائل پیدا ہوں گے کیوں کہ اُس کے لیے بھارت اور یورپی یونین دونوں ہی بڑی منڈیاں ہیں۔ یورپ ایک مدت سے چین پر منحصر رہا ہے اور چین چاہتا ہے کہ یہ انحصار قائم رہے اور پروان چڑھے۔

بھارت اور یورپی یونین کے درمیان مختلف سطحوں پر ایسا اشتراکِ عمل بھی ہے جس کے بارے میں دنیا زیادہ نہیں جانتی اور یہ دونوں بھی اِس معاملے میں زیادہ بڑھ چڑھ کر بولنا پسند نہیں کرتے۔ امریکا اور چین دونوں ہی کے لیے البتہ یہ امر تشویشناک ہے کہ بھارت اور یورپی یونین کے درمیان تجارت اور سرمایہ کاری کے ساتھ ساتھ ملازمتوں کا معاملہ بھی ہے۔ اس وقت یورپ کے کم و بیش ۶ ہزار صنعتی، تجارتی اور مالیاتی ادارے بھارت میں فعال ہیں۔ ان اداروں کی موجودگی سے بھارت کے کم و بیش ۱۷؍لاکھ باشندوں کو براہِ راست اور ۵۰ لاکھ سے زائد کو بالواسطہ روزگار ملا ہوا ہے۔ اگر بھارت اور یورپی یونین کے درمیان کاروباری معاملات بگڑ جائیں تو بھارت میں کم و بیش ڈیڑھ پونے دو کروڑ افراد کے لیے گزر بسر مشکل ہوجائے۔

یورپی یونین نے ادارے کی سطح پر اور اُس کے ارکان نے انفرادی حیثیت میں بھارت کو سرمایہ کاری کے مرکز کی حیثیت سے مستحکم تر کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ بھارت کی اسٹاک مارکیٹ میں یورپی یونین کے ارکان کی طرف سے کی جانے والی بلا واسطہ بیرونی سرمایہ کاری ۲۰۲۲ء میں ۱۰۸؍ارب ۳۰ کروڑ یورو تک پہنچ گئی جبکہ ۲۰۱۹ء میں یہ معاملہ ۸۲؍ارب ۳۰ کروڑ یورو تک تھا۔ اس کے نتیجے میں یورپی یونین بھارت میں نمایاں بلا واسطہ بیرونی سرمایہ کار کے طور پر ابھری ہے۔ یہ سب کچھ دونوں ملکوں کے کاروباری تعلقات کو مزید مستحکم کرنے کی راہ ہموار کر رہا ہے۔

بھارتی قیادت اچھی طرح جانتی ہے کہ یورپی یونین کے ارکان نے سرمایہ کاری کے معاملے میں چین اور برازیل پر زیادہ توجہ دی ہے۔ عالمی کاروباری ماحول کے حوالے سے بھارت کا بہت غلغلہ رہتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ برازیل نے اُسے پریشان کن حد تک ٹکر دے رکھی ہے۔ یورپی یونین کے ارکان کی طرف سے برازیل میں کی جانے والی بلا واسطہ سرمایہ کاری ۲۹۳؍ارب ۴۰ کروڑ یورو ہے جبکہ چین میں یہ سرمایہ کاری ۲۴۷؍ارب ۵۰ کروڑ یورو کے مساوی ہے۔ اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرمایہ کاری کے حوالے سے بھارت اب بھی یورپی یونین کی اولین ترجیح نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ بھارتی قیادت اپنی کاروباری کمیونٹی کو یورپ میں مزید وسعت اختیار کرنے اور قدم جمانے کی تحریک دیتی رہتی ہے اور معاملہ یہیں تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ اس حوالے سے پالیسیاں بھی تبدیل کی جاتی رہی ہیں۔

بھارت اور یورپی یونین رواں سال آزاد تجارت کے معاہدے کو حتمی شکل دینے کی کوشش کریں گے۔ یہ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا معاہدہ ہوگا۔ اِس کے نتیجے میں ۴۵ کروڑ نفوس پر مشتمل مارکیٹ ایک ارب ۴۰ کروڑ نفوس پر مشتمل مارکیٹ سے جُڑ جائے گی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایسے کسی بھی معاہدے کے نتیجے میں دنیا بھر میں کاروباری ماحول پر کس نوعیت کے اثرات مرتب ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت اور یورپی یونین کا ایک پلیٹ فارم پر آجانا عالمی تجارت میں غیر معمولی تبدیلیوں کا محرک بنے گا کیونکہ کئی ملکوں کی معیشت متاثر ہوگی۔ ایسے کسی بھی معاہدے کے نفاذ کی صورت میں امریکا، چین، برازیل اور دوسرے بہت سے بڑے مینوفیکچررز کے لیے اپنی اپنی معاشی حرکیات کو تبدیل کرنا ناگزیر ہوجائے گا۔ چین کی برآمدی تجارت میں کمی واقع ہونے سے مینوفیکچرنگ سیکٹر سکڑے گا اور یوں دوسرے بہت سے شعبے بھی دباؤ کا شکار ہوجائیں گے۔

بھارت اور یورپی یونین دونوں ہی کی خواہش ہے کہ آزاد تجارت کا معاہدہ جلد از جلد ہوجائے تاہم دونوں ہی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ یورپی یونین چاہتی ہے کہ اُس کی ۹۵ فیصد برآمدات پر ٹیرف ختم کردیا جائے۔ اِن میں زراعت اور آٹو موبائلز جیسے حساس شعبے بھی شامل ہیں۔ بھارت اپنی ۹۰ فیصد مارکیٹ کھولنا چاہتا ہے۔

بھارت یورپی یونین کے کاربن بارڈر ایڈجسٹمنٹ میکینزم (سی بی اے ایم)، جنگلات کے کٹاؤ کی روک تھام سے متعلق قوانین اور سپلائی چین سے متعلق قوانین کو اپنی تجارت کی راہ میں نان ٹیرف رکاوٹوں کے طور پر دیکھتا ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Strengthening the EU-India relationship". ("The Globalist". March 14, 2025)

ٹرمپ کا ٹیرف بلنڈر

George R. Tyler

یہ حقیقت تو اب بالکل واضح ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ امریکی معیشت کو نئی زندگی دینے کے لیے کچھ بھی کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ وہ دن رات ایسے اعلانات اور اقدامات کر رہے ہیں جن کے نتیجے میں صرف بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ دنیا بھر کے میڈیا کے ادارے امریکی صدر کے اقدامات کے حوالے سے خبردار کر رہے ہیں کیونکہ معیشتیں اکھاڑ پچھاڑ کا شکار ہیں۔ بہت سے چھوٹے ممالک کے لیے ابھی سے مشکلات بہت بڑھ گئی ہیں۔ زیرِنظر مضمون میں اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ ٹیرف کو ہتھیار بنا کر جو کچھ رہے ہیں، امریکی قیادت سردست بدحواس ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ معیشت کو کس طور مکمل بحالی کی راہ پر گامزن کیا جائے۔ تجارتی خسارہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ اِس کے بعد توازنِ ادائیگی کے رخصت ہونے کی باری ہے۔ امریکا اپنی برآمدات کو بڑھانا اور درآمدات کو گھٹانا چاہتا ہے مگر سوال لاگت کا ہے۔ امریکا میں تیار کی جانے والی اشیا کی لاگت بہت زیادہ آرہی ہے۔ امریکی برآمدات بڑھ نہیں پارہیں۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ٹیرف (درآمدی ڈیوٹی) بڑھائی ہے تو اِس کی دو وجوہ ہیں۔ امریکا کو زیادہ محصولات کی ضرورت ہے اور دوسری طرف وہ بلاواسطہ ٹیکس بڑھانے سے مجتنب ہے۔ اِس کے لیے ٹیرف کا سہارا لیا جارہا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ٹیرف کے نام پر جو کچھ بھی ڈونلڈ ٹرمپ کر رہے ہیں، اُس سے امریکا سمیت دنیا بھر میں کروڑوں گھرانوں کو معاشی مشکلات کا تادیر سامنا کرنا پڑے گا۔ ساتھ ہی ساتھ ٹرمپ اور ری پبلکن پارٹی کا ووٹ بینک بھی متاثر ہوگا۔

بڑھتا ہوا امریکی قرضہ

ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے پہلے عہدِ صدارت کے دوران ٹیکسوں میں بڑے پیمانے پر کٹوتیاں کی تھیں۔ اِس کے نتیجے میں امریکا پر قرضہ بڑھ گیا تھا۔ رواں سال صدر ٹرمپ نے ٹیکسوں میں اضافی کٹوتیوں کا اعلان کیا ہے جس کے نتیجے میں امریکا کے مجموعی قرضے میں ۲۰ فیصد اضافہ ہوگا۔ صدر ٹرمپ نے ۲۰۱۷ء میں ٹیکسوں میں جن کٹوتیوں کا اعلان کیا تھا، وہ دس سالہ حساب کتاب ذہن میں رکھتے ہوئے کی گئی تھیں۔ اس مدت میں کٹوتیوں کے اقدامات کی مجموعی لاگت کم و بیش ۴ ہزار ۶۰۰ ارب ڈالر ہونی تھی۔ وہ مزید ۲ ہزار ارب ڈالر کی ٹیکس کٹوتیاں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ریاستی سطح کی ٹیکس کٹوتیوں اور مقامی ٹیکسوں کی بحالی کی صورت میں مزید ۱۲۰۰ ارب ڈالر کا بوجھ پڑے گا۔

کانگریس میں ری پبلکن پارٹی کے معاشی انتہا پسندوں اور فیڈرل ریزرو نے قرضوں میں اضافے کی حکمتِ عملی کو مسترد کر دیا ہے۔ سرکاری محکموں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے قائم کیے جانے والے ادارے DOGE کی چھتری تلے ارب پتی آجر ایلون مسک نے جو اقدامات کیے ہیں، اُن سے وفاقی بجٹ کے لیے تھوڑی سی بہتری پیدا ہوئی ہے۔

صاحبانِ ثروت کی پارٹی

مالیاتی حوالے سے ڈونلڈ ٹرمپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، اُس کی جڑ میں دراصل ری پبلکن پارٹی کا آج کا کردار اور مزاج ہے۔ ری پبلکن پارٹی اب ارب پتی امریکیوں کی پارٹی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کا جو بھی ایجنڈا ہے، وہ اب انتہائی مالدار عطیہ کنندگان اور کارپوریٹ بورڈز کا طے کیا ہوا ہے۔ ۲۰۲۴ء میں ری پبلکن پارٹی کو انتہائی مالدار افراد کی طرف سے ملنے والے مجموعی عطیات ۲ ارب ۴۷ کروڑ ڈالر تھے۔ ری پبلکن پارٹی کے مجموعی عطیات میں اِن ۲ ارب ۴۷ کروڑ ڈالر کا حصہ ۵۶ فیصد تھا۔

یہ بات کسی بھی سطح پر حیرت انگیز نہیں ہے کہ ری پبلکن پارٹی کو عطیات دینے والے یہ مالدار افراد ٹیکس ادا کرنے کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ ایلون مسک کی مثال سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ یہ لوگ ٹیکس ادا کرنے سے بچنے کے لیے جمہوریت کی جڑیں کھوکھلی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

یہ مالدار افراد اور کارپوریٹ ادارے بلند اجرتوں اور مزدور انجمنوں کی تشکیل اور تحرک کے بھی مخالف ہیں۔ ٹرمپ اُن کے مؤقف کو درست سمجھتے ہیں۔ کیا اس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ تیزی سے پنپتے ہوئے متوسط طبقے کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے بلند اجرتیں بھی لازم ہیں اور اجتماعی سَودا کار انجمنوں کا ہونا ناگزیر ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ ری پبلکن پارٹی کی کامیابی کا مدار محنت اور متوسط طبقے کے ووٹروں پر ہے۔ اگر محنت کشوں اور زیریں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے حالات بگڑیں گے تو وہ ری پبلکن پارٹی سے بدظن ہوں گے اور اگلے صدارتی الیکشن میں اُن کی حمایت ری پبلکنز کو حاصل نہ ہو سکے گی۔

معمولی فرق سے فتح

۲۰۲۴ء کے صدارتی انتخاب میں ڈونلڈ ٹرمپ پنسلوانیا، مشی گن اور وسکونسن جیسی سوئنگ ریاستوں میں بہت معمولی فرق سے جیتے۔ پنسلوانیا میں یہ فرق ایک اعشاریہ سات فیصد، مشی گن میں ایک اعشاریہ چار فیصد اور وسکونسن میں صفر اعشاریہ ۸ فیصد تھا۔ ان تینوں سوئنگ ریاستوں میں کملا ہیرس مجموعی طور پر ایک لاکھ ۱۵ ہزار ووٹوں کے معمولی فرق سے شکست کھا گئیں۔ ٹرمپ کی یہ فتوحات واقع نہ ہوئی ہوتیں تو کملا ہیرس امریکی صدر ہو جاتیں۔ ان ریاستوں میں نصف سے زائد ووٹر سفید فام اور نان کالج تھے۔ ان کی غالب اکثریت نے غیر معمولی افراطِ زر اور معاشی الجھنوں کو اہم ترین مسئلہ بتایا تھا۔

یہ امر کسی بھی سطح پر حیرت انگیز نہیں کہ ری پبلکن پارٹی کے بڑے عطیہ کنندگان میں اجتماعی سودا کار انجمنوں کے لیے حمایت برائے نام بھی نہیں۔ ٹرمپ نے ٹیرف کا کھڑاگ بھی اس لیے ڈالا ہے کہ مینوفیکچرنگ سیکٹر میں نئی ملازمتوں کی گنجائش پیدا ہو سکے۔ اگر ٹیرف محدود پیمانے پر لگائے جاتے یا اُن میں معمولی اضافہ کیا جاتا تو بہتری کا امکان تھا۔ اِس سے بہت مدد ملتی مگر کیا کیجیے کہ ڈونلڈ ٹرمپ تو ہر معاملے میں بڑی سوچ اپنانے کے عادی ہیں۔ دنیا بھر میں ٹیرف کے ہاتھوں آگ سی لگی ہوئی ہے۔ ٹرمپ نے اندازہ لگایا تھا کہ جیسے ہی وہ ٹیرف عائد کریں گے، دنیا گھبرا جائے گی اور امریکا کے آگے گھٹنے ٹیک دے گی۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ اب یہ طے ہے کہ ٹرمپ نے قومی آمدنی میں جس اضافے کا سوچا تھا، وہ ممکن نہ ہو پائے گا۔

ٹرمپ کا فلاپ معاشی ڈراما

اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹرمپ نے جو ٹیرف کارڈ کھیلا ہے، اُس سے دنیا بھر میں ہنگامہ برپا ہے کیوں کہ پہلے مرحلے میں تو بہت کچھ الٹ پلٹ جائے گا۔ دنیا بھر سے امریکا پہنچنے والی مصنوعات پر اوسط ڈیوٹی ڈھائی فیصد سے اچانک بائیس فیصد تک جا پہنچے گی۔ اِس کے نتیجے میں بہت سی مصنوعات امریکا میں مہنگی پڑیں گی اور یوں صارفین اپنے ملک میں تیار کی جانے والی مصنوعات استعمال کرنے پر مائل ہوں گے۔

ٹرمپ نے دوبارہ صدر کا انتخاب محض اس لیے جیتا تھا کہ افراطِ زر کی شرح بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ لوگ مہنگائی سے پریشان تھے۔ معیارِ زندگی بُری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ لوگ تبدیلی چاہتے تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ ری پبلکنز آئیں اور کچھ ایسا کر دکھائیں کہ اُن کی زندگی میں بہتری آئے۔ اب ٹیرف کے ہاتھوں امریکا میں چینی مصنوعات ۲۲ فیصد اور یورپی مصنوعات ۱۷ فیصد مہنگی ہو جائیں گی۔ اگر یورپ اور چین کی بہت سی مصنوعات کا متبادل امریکا نہ ہوا تو صورتحال بہت پریشان کن ثابت ہوگی۔ جے پی مورگن نے پیش گوئی کی ہے کہ ٹیرف میں اضافے کے نتیجے میں امریکا میں گاڑیوں کی قیمت میں اوسطاً ۴ء۱۱ فیصد تک اضافہ ہوگا۔ اس کے نتیجے میں مجموعی افراطِ زر میں ۲۰۲۵ء کے دوران ۷ء۲ فیصد تک اضافہ ہوگا۔ عمومی قیمتوں میں یہ اضافہ بیشتر امریکیوں کے لیے غیر معمولی اور غیر ضروری بوجھ ثابت ہوگا اور یوں گھرانوں کی بنیاد پر آمدنی میں اچھی خاصی کمی واقع ہو جائے گی۔ دی نان پارٹیشن ٹیکس فاؤنڈیشن نے تخمینہ لگایا ہے کہ درآمدی ڈیوٹی بڑھنے سے عام امریکی کو سال بھر میں اِتنی زیادہ قیمت ادا کرنا پڑے گی گویا اُس نے ۱۹۰۰ ڈالر کا ٹیکس ادا کیا ہو۔ امریکا میں صارفین کا اعتماد مجروح ہوا ہے۔ صارفین کے اعتماد میں ۳۰ فیصد تک واقع ہونے والی گراوٹ کے نتیجے میں عالمی سطح پر کساد بازاری میں ۴۰ فیصد تک اضافہ ہوگا۔ امریکی گھرانوں کی اکثریت زیادہ خرچ نہیں کر پائے گی اور بیشتر معاملات میں سہولتوں کی شدید کمی محسوس کرے گی۔

امریکا میں رواں سال شرحِ نمو میں صرف اعشاریہ سات فیصد کی کمی واقع ہوگی۔ اس کے نتیجے میں بعد از ٹیکس آمدن میں کم و بیش ۲ فیصد کمی واقع ہوگی اور کیپٹل بیس میں صفر اعشاریہ ۶ فیصد سکڑاؤ واقع ہوگی جس کے نتیجے میں کم از کم ۶ لاکھ ملازمتیں جاتی رہیں گی۔

کاروبار پر اثرات

ڈونلڈ ٹرمپ کی طرف سے ٹیرف بڑھانے کے اقدامات سے امریکا بھر میں کاروباری یعنی صنعتی ادارے خصوصی طور پر متاثر ہوں گے۔ فیکٹریاں اور آٹو پلانٹس جو پُرزے اور خام مال درآمد کرتے ہیں، وہ مہنگے ہو جائیں گے۔ اس کے نتیجے میں اِن اداروں کو اپنی مصنوعات کی قیمتیں بڑھانا پڑیں گی۔ قیمتیں بڑھانے سے فروخت گھٹے گی۔ نقصان کا دائرہ محدود رکھنے کے لیے ان اداروں کو چھانٹیاں بھی کرنی پڑیں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ درآمدات مہنگی ہونے سے امریکی مصنوعات کی کھپت بڑھے گی مگر ٹرمپ کے پہلے دورِ صدارت کے دوران ۲۰۱۸ء اور ۲۰۱۹ء کے دوران ٹیرف کی پہلی لہر کے نتیجے میں انفرادی آمدنی گھٹی تھی اور جی ڈی پی میں بھی کمی واقع ہوئی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوسکتا ہے۔ ٹرمپ چاہتے ہیں کہ امریکن ہارٹ لینڈ میں معاشی سرگرمیاں بھرپور توانائی کے ساتھ بحال ہوں مگر جی ڈی پی میں واقع ہونے والی کمی سے اُن کا خواب چکنا چور ہوسکتا ہے۔ اُجرتوں اور ملازمت کے مواقع میں ہونے والا اضافہ رُکنے سے زیریں متوسط اور محنت کش طبقات کے مرد و زن شدید مشکلات سے دوچار ہوسکتے ہیں۔

شکایات کی پروا نہیں

ڈونلڈ ٹرمپ صارفین اور کاروباری اداروں کی طرف سے آنے والی شکایات پر دھیان نہیں دیتے بلکہ اُنہیں یکسر مسترد کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے گزشتہ برس کے صدارتی انتخاب میں افراطِ زر اور معاشی مسائل سے متعلق شکایات کا بھرپور فائدہ اٹھا کر ووٹرز کے جذبات ابھارے اور اُن سے بہتری کے وعدے کیے۔ اِس وقت ٹرمپ ایک بڑا سبق بھول رہے ہیں۔ وہ اور اُن کی ٹیم کے ارکان کُھل کر، ڈھٹائی سے کہہ رہے ہیں کہ سستی اشیا کا حصول ترجیحات میں سرِفہرست نہیں۔ وہ تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ گاڑیاں مہنگی ہوتی ہیں تو ہوا کریں۔ ٹرمپ انتظامیہ کی پالیسیوں کے نتیجے میں کساد بازاری کی راہ ہموار ہو رہی ہے مگر اُسے کچھ پروا ہی نہیں۔ صدر ٹرمپ کو صورتحال کی سنگینی کا احساس نہیں۔ وہ اس بات سے بھی بے نیاز سے رہتے ہیں کہ اُن کی کسی بھی پالیسی کے کیا نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

جوابی اقدامات

یہ نکتہ ہر حال میں ذہن نشین رہنا چاہیے کہ تجارتی جنگیں بہت تیزی سے شدت اختیار کرتی ہیں اور پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہیں۔ امریکا کی طرف سے عائد کیے جانے والے ٹیرف کے جواب میں چین، کینیڈا، جاپان اور یورپ کے ردِعمل اور جوابی اقدامات کے نتیجے میں تجارتی جنگ انتہائی پیچیدہ ہوتی جارہی ہے۔ یہ سب کچھ انتہائی منفی اثرات کا حامل ہوگا۔ امریکی کسانوں کی پیداوار کا بڑا حصہ چین اور دیگر ترقی یافتہ اقوام خریدتی ہیں۔ ٹیرف کے نتیجے میں امریکی کسان براہِ راست متاثر ہوں گے۔ ٹرمپ نے یہ حقیقت بھی نظر انداز کر دی ہے کہ ۲۰۱۸ء میں جب ٹرمپ انتظامیہ کی طرف سے عائد کیے جانے والے ٹیرف کے جواب میں چینی حکومت نے بھی ٹیرف کارڈ کھیلا تو امریکی سویابین، گندم، بیف اور مکئی کی برآمدات کو شدید دھچکا لگا اور اِس کے نتیجے میں امریکی کھیتوں کی آمدنی میں دسیوں ارب ڈالر کی کمی واقع ہوئی۔ جب کسانوں نے احتجاج کیا تو ٹرمپ انتظامیہ نے اُن کی مالی مدد کی۔ کاؤنسل آن فارن ریلیشنز کے مطابق ہوا یہ کہ دوسرے ملکوں پر ٹیرف عائد کرنے سے امریکا کی آمدنی میں ۶۲ ارب ڈالر کا اضافہ ہوا تاہم کسانوں کو دی جانے والی مالی امداد ۶۱ ارب ڈالر تھی!

حتمی نتیجہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹرمپ انتظامیہ آنے والے چند ماہ کے دوران بہت سے کاروباری اداروں یا شعبوں کو خطیر رقوم پر مبنی بیل آؤٹ پیکیج دے رہی ہوگی۔ ایسا ہوا تو ٹیرف لگانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ محصولات کی آمدنی میں کمی واقع ہوگی اور یوں ملک وہیں کا وہیں کھڑا رہ جائے گا۔ ایسی کسی بھی صورتحال سے بچنے کے لیے لازم ہے کہ ٹیکس بڑھائے جائیں اور اضافی آمدنی سماجی بہبود کی مد میں خرچ کی جائے تاکہ محنت کش اور زیریں متوسط طبقہ ری پبلکن پارٹی سے بدظن و بدگمان نہ ہو۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ کوئی بھی تجارتی جنگ کسی بھی صورت معقول نتائج کی حامل نہیں ہوتی۔ ایسی ہر جنگ سے لاکھوں، کروڑوں افراد متاثر ہوتے ہیں اور اُن کی زندگیاں یوں تلپٹ ہو جاتی ہیں کہ پھر سنبھلنے اور دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں زمانے لگ جاتے ہیں۔ ہر تجارتی جنگ کی طرح یہ تجارتی جنگ بھی خطرناک اور انتہائی پریشان کن نتائج کی حامل ثابت ہوگی۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

جارج آر ٹائلر ماہرِ معاشیات اور ”واٹ وینٹ رانگ“ اور بلینئرز ڈیموکریسی: دی ہائی جیکنگ آف دی امریکن پولیٹیکل سسٹم“ کے مصنف ہیں۔ وہ امریکا کے نائب وزیرِ خزانہ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

"Understanding Trump's tariff blunder". ("The Globalist". April 7, 2025)

پندرہ روزہ
”مَعارف فیچر“
کے تازہ شمارے اور مضامین
پڑھنے کے لیے دیکھیے:
maariffeature.com

برطانیہ: سچ سمجھنا اور بولنا پڑے گا

Jonathan Freedland

یہ تو اب ماننا ہی پڑے گا کہ امریکا دنیا کو ویسی نہیں رہنے دینا چاہتا جیسی وہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے رہی ہے۔ وہ اپنے مفادات کا تحفظ یقینی بنانے کی خاطر کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہے۔ صدر ٹرمپ کی شکل میں امریکا کو ایک ایسا لیڈر ملا ہے جو تمام ہی معاملات کو الٹنے، پلٹنے کے لیے محض تیار نہیں بلکہ بے تاب ہے۔ جو کچھ ٹرمپ انتظامیہ کرنے پر تُلی ہوئی ہے، اُس کے بارے میں سوچ سوچ کر دنیا پریشان ہوئی جاتی ہے اور اس معاملے میں برطانیہ پیش پیش ہے۔ برطانوی قیادت اس وقت تذبذب کے عالم میں ہے۔ وزیرِاعظم کیئر اسٹارمر شش و پنج میں مبتلا ہیں۔ وہ امریکا کے ارادوں کو بھانپ بھی چکے ہیں اور کچھ کہنے سے گریز بھی کر رہے ہیں۔

اس حقیقت سے اب کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ ہر معاملے کو اُلٹنے، پلٹنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اِس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ دنیا بھر کے سرکردہ سیاست دانوں کو اس حوالے سے لب کُشائی کرنی ہی چاہیے تاکہ عام آدمی کو معلوم ہوسکے کہ جو کچھ ٹرمپ کر رہے ہیں، اُس کے سنگین اثرات و نتائج، حتمی تجزیے میں، کیا ہوسکتے ہیں۔ امریکی صدر کے اقدامات سے یورپ بھر میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ کچھ معاملات سامنے ہیں اور کچھ ڈھکے چھپے ہیں۔ برطانوی وزیراعظم کیئر اسٹامر اپنے لوگوں کو ٹرمپ انتظامیہ کے اقدامات کے سنگین نتائج کے حوالے سے خاطر خواہ حد تک کچھ نہیں بتا رہے۔ کیئر اسٹارمر کو یہ خدشہ لاحق ہے کہ اگر اُنہوں نے ٹرمپ انتظامیہ کے اقدامات کے حوالے سے کوئی بھی ایسی ویسی بات کہی تو واشنگٹن کی طرف سے شدید ردِعمل کا سامنا ہوسکتا ہے۔ خیر، کیئر اسٹارمر کو اس معاملے میں دیانت کی راہ پر گامزن ہونا ہی پڑے گا۔

کیئر اسٹارمر کے لیے بورس جانسن ایک ایسے رول ماڈل ہیں جس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ بورس جانسن کے بہت سے اقدامات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ اُن کی وزارتِ عظمیٰ میں برطانیہ نے کچھ خاص پیشرفت نہیں کی۔ وہ زیادہ کامیاب وزیراعظم نہ تھے مگر خیر، ایک معاملے میں تو اُنہیں معقول اور بڑا ماننا ہی پڑے گا۔ انہوں نے پانچ سال قبل ٹی وی پر قوم سے براہِ راست خطاب کیا اور وہ سب کچھ بیان کردیا جو انہیں بیان کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے برطانوی باشندوں کے مجموعی مفادات کو لاحق خطرات کے بارے میں کھل کر بات کی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے قوم سے یہ بھی کہا کہ آنے والا زمانہ بہت اچھا نہیں ہوگا، اِس لیے کچھ نہ کچھ سہنے کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ اب کیئر اسٹارمر کو بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا اور یہ اس لیے نہیں ہوگا کہ کسی بڑے بحران کی آمد کا اندیشہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ تو آ ہی چکے ہیں۔

بورس جانسن نے صرف ۶ منٹ کا خطاب کیا۔ یہ خطاب بہت سے معنوں میں بڑی تبدیلی کا نقیب تھا۔ اس خطاب نے برطانوی باشندوں کو احساس و یقین دلایا کہ ہم ہنگامی حالت میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہاں بہت کچھ تھا۔ شہری آزادیوں کے معاملے میں برطانیہ کو ایک مثال قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اب یہ سب کچھ خیال و خواب کا معاملہ لگتا ہے۔ ہم نے بہت سی نعمتوں کو درخورِ اعتنا سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اب بہت کچھ بدل چکا ہے۔ بورس جانسن نے کہا کہ ہمیں گھر پر رہنا سیکھنا ہوگا اور ہم نے سیکھا۔ کووڈ کے زمانے میں بہت کچھ قربان کرنا پڑا تھا۔ بورس جانسن نے لوگوں کو حوصلہ دیا۔ وہ حقیقت پسند تھے اور حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے وہ سب کچھ کہا جو عام طور پر کوئی بھی راہنما کھل کر کہنے سے ڈرتا ہے۔ ہاں، بعد میں یہ بات کُھلی کہ بورس جانسن اور اُن کے رفقا نے قوم سے جو قربانی مانگی تھی، وہ خود اُنہوں نے نہیں دی۔ ردِعمل میں لوگ بپھر گئے اور بورس جانسن کا دھڑن تختہ ہوگیا۔

کیئر اسٹارمر کو احساس ہونا چاہیے کہ اس وقت برطانیہ سمیت پوری دنیا ہنگامی حالت سے دوچار ہے۔ اُنہیں بہت سی باتیں کُھل کر کرنی چاہئیں۔ بہترین موقع تب تھا جب صدر ٹرمپ نے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے سامنے اپنے یوکرینی ہم منصب وولودومیر زیلنسکی کی تذلیل کی تھی اور دھمکایا تھا۔ ایک دنیا نے خود دیکھا کہ امریکی صدر دوسری جنگِ عظیم کے بعد قائم کیے جانے والے عالمی سیاسی و معاشی نظام کو تباہ کر رہے ہیں۔ خیر، کیئر اسٹارمر کے لیے وقت ابھی نہیں گزرا۔ اُنہیں سامنے آکر کُھل کر بات کرنی چاہیے۔

ہر گزرتا ہوا دن امریکی صدر کے حوالے سے خدشات کو درست ثابت کرتا جارہا ہے۔ ایک دنیا یہ سمجھتی رہی ہے کہ ٹرمپ کی امریکی ایوانِ صدر میں دوبارہ آمد کے نتیجے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی اور یہ کہ صدر ٹرمپ کا وجود سیاسی جسم کے لیے ناسور کا سا ہے اور یہ بات اب درست ثابت ہوتی جارہی ہے۔ ایک طرف تو وہ دنیا بھر میں اتحادیوں کو چھوڑ رہے ہیں۔ گرین لینڈ اور کینیڈا کے معاملے میں انہوں نے کُھل کر دھمکانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ کئی ممالک ڈرے ہوئے ہیں۔ چھوٹوں کا تو حال بُرا ہے۔ اُنہیں اب کوئی شک نہیں رہا کہ صدر ٹرمپ امریکی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی غرض سے کسی بھی ملک کے خلاف نئی عسکری مہم شروع کرسکتے ہیں۔ اب تک یورپ کو امریکا کا سب سے بڑا اتحادی اور شریکِ کار سمجھا جاتا رہا ہے مگر اب یورپی اقوام کو بھی امریکی حملے کا خدشہ لاحق ہے۔ دوسری طرف امریکی صدر نے ٹیرف کے معاملے میں انتہائی کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔ وہ درجنوں ممالک کو ڈرا رہے ہیں۔ تجارت کے معاملے میں چین کا سامنا کرنے کی سکت نہ ہونے پر ٹرمپ انتظامیہ ڈرانے دھمکانے پر اُتر آئی ہے۔ چین، کینیڈا، میکسیکو، بھارت اور دوسرے بہت سے ملکوں کو خوفزدہ کرکے امریکا کے لیے گنجائش پیدا کی جارہی ہے۔ کیئر اسٹارمر کو اس حوالے سے بھی کوئی لگی لپٹی نہیں رکھنی چاہیے اور جو کچھ بھی کہنا چاہیے، وہ کہہ دینا چاہیے۔ کیئر اسٹارمر کو قوم سے اپنا خطاب اس طور شروع کرنا چاہیے کہ میں آج رات آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے براعظم میں جمہوریت سے آمریت کے ٹکراؤ میں امریکا نے پارٹی بدل لی ہے۔ برطانوی وزیراعظم بتاسکتے ہیں کہ امریکی صدر نے روسی ہم منصب سے ہاتھ ملانا منظور کرلیا ہے۔ ایسے میں برطانوی حکومت کے پاس اپنی پالیسیاں بدلنے کے سوا کون سا آپشن بچا ہے؟ برطانیہ کو اپنے دفاع کا مرحلہ بھی درپیش ہے۔ کیئر اسٹارمر قوم سے کہہ سکتے ہیں کہ امریکی سیاسی سوچ اور پالیسیوں میں یہ تبدیلی ہم سے بھی غیر معمولی قربانی کا مطالبہ کرتی ہے اور یہ کہ ایسا کرنا کسی طور آسان نہ ہوگا۔ اس وقت برطانوی قوم کو زیادہ سے زیادہ اعتماد کی ضرورت ہے۔ وزیراعظم اسٹامر کے لیے لازم ہے کہ اس مشکل گھڑی میں قوم کی ڈھارس بندھائیں، اُسے آنے والے وقت کے لیے ڈھنگ سے تیار کریں۔ قوم کا مورال بلند کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ وقت کسی بھی معاملے کو چُھپانے کا نہیں ہے۔ کیئر اسٹارمر اور اُن کی ٹیم کو قوم کے سامنے پورا سچ بول دینا چاہیے۔ قوم چاہتی ہے کہ کسی بھی معاملے کو چُھپایا نہ جائے، کوئی بھی بات سات پردوں میں لپیٹ کر بیان نہ کی جائے۔

اگر سچ بولا جائے گا تو قوم خود کو آنے والے وقت کے لیے ڈھنگ سے تیار کر سکے گی۔ برطانیہ کے لیے لازم ہے کہ خود کو ایک ایسے ماحول کے لیے تیار کرے جس میں امریکا دوست سے کہیں بڑھ کر دشمن کا سا ہے۔

برطانیہ کو دفاعی صلاحیت میں بھی اضافہ کرنا ہے۔ فرانس اور جرمنی بھی ایسا ہی کر رہے ہیں کیوں کہ اُنہوں نے بھی خطرات بھانپ لیے ہیں۔ یوکرین کی صورتحال نے اُنہیں دفاعی پالیسیوں پر نظرِ ثانی پر مجبور کر دیا ہے۔ برطانیہ اب امریکا پر کُلی بھروسا نہیں کر سکتا کیوں کہ ٹرمپ کی پالیسیوں میں تسلسل نہیں۔ سیاست بدل گئی ہے اور تزویراتی معاملات بھی وہ نہیں رہے۔

برطانیہ میں رجعت پسند عناصر بالعموم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ معاشی معاملات میں ریاست زیادہ دخل دے مگر کووڈ کے زمانے میں وزیرِ اعظم بورس جانسن نے اُنہیں بھی قائل کر لیا کہ معیشت کو متحرک رکھنے کے لیے سیکڑوں ارب ڈالر لگائے جائیں۔ اور ایسا ہی کیا گیا۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی شکل میں جو جھکڑ چل رہا ہے، اُس سے بچنے کے لیے کیئر اسٹارمر بھی اہلِ وطن کو اعتماد میں لے کر معیشت کو مضبوط بنانے کی خاطر ریاستی فنڈنگ کر سکتے ہیں۔ برطانوی معیشت کا حال بہت اچھا نہیں۔ دفاعی اخراجات میں اضافے کی زیادہ گنجائش نہیں۔ ہتھیاروں کی بڑے پیمانے پر خریداری بھی آسان نہیں۔ بہبودِ عامہ کے فنڈز کو دفاعی بجٹ کی نذر کرنے سے معاشرے میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ برطانیہ میں بھی اضافی دفاعی اخراجات کا بیشتر بوجھ ملک کے غریب ترین لوگوں ہی کو بھگتنا ہوگا۔ ایک طرف تو برطانوی حکومت اندرونِ ملک غریبوں کا حق مارنے پر مجبور ہوگی اور دوسری طرف وہ پسماندہ ممالک کے امدادی بجٹ میں کٹوتی کرے گی یعنی مختلف منصوبوں کے لیے برطانیہ کی طرف سے فنڈز نہیں ملیں گے۔

برطانوی قیادت پر لازم ہو چکا ہے کہ عوام کو کُھل کر بتائے کہ دس سال پہلے کی دنیا اب نہیں رہی۔ امریکا بھی بدل چکا ہے اور اُس کی ترجیحات بھی۔ امریکی پالیسیوں میں یورپ کا اب وہ مقام نہیں رہا جو دس بارہ سال قبل تھا۔ تجارتی جنگ نے بہت کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ بریگزٹ کے وقت کی دنیا اب نہیں رہی۔ اور برطانیہ کے لیے امکانات بھی وہ نہیں رہے جو ہوا کرتے تھے۔

اگر لیبر پارٹی ملک کو درپیش مسائل بیان کرنا چاہے تو کوئی بھی بات چھپانا پسند نہیں کرے گی۔ نئے امکانات پر بات ہوگی اور جو بحران اِس وقت ہیں، اُن کے تدارک کے بارے میں سوچنے کی گنجائش پیدا کرنے کو ترجیح دی جائے گی۔ ایک عشرے کے دوران دنیا اِتنی بدل چکی ہے کہ برطانوی پالیسیوں کو تبدیل کیے بغیر چارہ نہیں۔ امریکا پر اب زیادہ بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ اور بعض معاملات میں تو ذرا سا بھروسا کرنے کی بھی گنجائش نہیں۔ امریکا اب ایک بڑی تجارتی جنگ شروع کر رہا ہے۔ چین اُس کا مرکزی حریف ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ اس جنگ میں صرف چین ایندھن بنے گا۔ برطانیہ بھی الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اس تجارتی جنگ میں برطانیہ کو اپنے بھروسے کے پارٹنرز سے فاصلہ نہیں رکھنا بلکہ اُن کے ساتھ کھڑا ہونا ہے۔ ایک برطانیہ ہی پر کیا موقوف ہے، پورے یورپ کو بہت سوچ سمجھ کر راستے چُننے ہیں۔ کسی ایک فریق کی طرف جھکاؤ ظاہر کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہوگا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ یورپ اپنی مارکیٹ بچانے کے لیے دوسروں کو نظرانداز کر دے۔ سنگل مارکیٹ کا تصور مٹ رہا ہے۔ یہ مقابلے کی دنیا ہے۔ کسی بھی مارکیٹ کو بند نہیں کیا جاسکتا۔ دروازے بند کرنے سے امکانات بھی نہیں آسکیں گے۔

ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یورپ میں بہت سے سیاسی قائدین اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ امریکا نے اب بھی اُن کے بارے میں رائے نہیں بدلی۔ یہ خوش فہمی بہت بڑے پیمانے پر پائی جاتی ہے کہ امریکا اب بھی یورپ کو اپنا سب سے بڑا اتحادی سمجھتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکا صرف اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی بات کر رہا ہے۔ اِس سے زیادہ اُسے کچھ بھی مطلوب نہیں۔ برطانیہ میں بھی سیاسی قائدین اِس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ امریکا اب بھی اُن کا ہے اور اُن کے لیے بہت کچھ کر گزرے گا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ایک سے ڈیڑھ عشرے کے دوران بہت کچھ بدل چکا ہے اور وہ کل والی دنیا کہیں گم ہو چکی ہے۔ آج کی دنیا میں امریکا کو صرف اپنی پڑی ہے۔ یورپ بھی اُس کے لیے محض ایک فریق ہے نہ کہ دوست یا اتحادی۔ امریکا اور یورپ کا تعلق خصوصی نوعیت کا رہا ہے۔ نوعیت اب بدل چکی ہے۔ امریکا کے لیے یورپ خصوصی ہے نہ بہت اہم۔ اگر یورپ تجارتی جنگ میں ہار کی طرف جائے گا تو امریکا اُس سے مزید دوری اختیار کرے گا۔ باقی یورپ کی طرح برطانیہ کو بھی یہ خوف لاحق ہے کہ اگر اُس نے امریکی پالیسیوں کو مسترد کیا، ٹرمپ انتظامیہ سے دوری اختیار کی تو دفاعی معاملات میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی کیوں کہ یورپ کا دفاع اب بھی بہت حد تک امریکا سے اشتراکِ عمل سے جُڑا ہوا ہے۔ یورپ اب بھی اپنا دفاع تنِ تنہا نہیں کر سکتا۔ یورپی یونین اس معاملے میں تاحال بُودی ثابت ہوتی آئی ہے۔ یوکرین کی جنگ نے بھی یورپ میں دفاع کے حوالے سے مطلوب یا خاطر خواہ سنجیدگی پیدا نہیں کی۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ نے کسی بھی معاملے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی، وہ صرف امریکا کا سوچ رہے ہیں۔ ایسے میں یورپ کو امریکا سے الگ ہونا ہی پڑے گا، اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ امریکا سے فاصلہ رکھنے کی ابتدا اب یورپ کو کرنی ہی پڑے گی۔ اس معاملے میں کلیدی کردار برطانیہ کو ادا کرنا ہے۔ برطانیہ کو اب ایسی پالیسیاں اختیار کرنی ہیں جن کے نتیجے میں اُس کے یورپی پڑوسی بھی مضبوط ہوں۔ اشتراکِ عمل بہت بڑے پیمانے پر لازم ہے۔ معاہدۂ شمالی بحرِ اوقیانوس کی تنظیم نیٹو کو مضبوط رکھنے کا سب سے کارگر طریقہ یہ ہے کہ برطانیہ سمیت تمام یورپی ریاستیں اشتراکِ عمل کی طرف جائیں اور دفاع سمیت ہر معاملے میں امریکا کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں۔

برطانوی قائدین اس وقت، فطری طور پر، خوفزدہ ہیں۔ وہ اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ اگر انہوں نے ٹرمپ انتظامیہ کی پالیسیوں پر ذرا سی بھی تنقید کی یا اُنہیں مسترد کیا تو شدید ردِعمل، بلکہ ٹرمپ کے غیظ و غضب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وزیرِ اعظم کیئر اسٹارمر فی الحال امریکا کو یہ یقین دلانے میں مصروف ہیں کہ برطانیہ دوسری یورپی ریاستوں کی طرح نہیں، اس لیے امریکا کو اُس سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔

یوکرین کے معاملے میں برطانیہ الگ ہو کر چلنا چاہتا ہے۔ اُس کی کوشش ہے کہ ایک بین الاقوامی فوج ہو جو یوکرین کے معاملات کی نگرانی کرے، مگر امریکا اس معاملے میں الگ سوچ رکھتا ہے۔ وہ ایسی کوئی بھی بین الاقوامی فوج دیکھنا نہیں چاہتا جس میں چین اور روس کا کوئی کردار ہو۔ یوکرین کو یورپ کا معاملہ گردانتے ہوئے امریکا اپنی ذمہ داری سمجھنے کا تاثر دینا چاہتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اس حوالے سے کوئی کلیدی کردار ادا کرنے کا شوقین بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یورپ کے لیے امریکا کے خصوصی ایلچی وٹکوف کہتے ہیں کہ روسی صدر پوٹن بھی ذہین ہیں اور انہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

ٹرمپ انتظامیہ اس حقیقت کو کُھل کر بیان کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کر رہی کہ دنیا بدل چکی ہے۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی طرزِ گفتگو انتہائی جارحانہ ہے۔ یوکرینی ہم منصب وولودومیر زیلنسکی سے اُنہوں نے وائٹ ہاؤس میں جو سلوک

////// باقی صفحہ نمبر ۱۵ \\\\\\

بھارت کا نیا وقف قانون

مسلمانوں کے حقوق پر شب خون

افتخار گیلانی

ایسی حکومت، جس کے پاس ایک بھی مسلم رکن پارلیمنٹ نہیں، مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے راگ الاپتی ہے، جب کہ اس کا سیاسی ڈھانچا نفرت انگیز تقاریر، حاشیے پر ڈالنے والی پالیسیوں اور مسلمانوں کو قانونی جال میں جکڑنے کی مہم چلا رہا ہے۔

غالباً ۲۰۱۸ء میں جب جموں و کشمیر کے گورنر نریندر ناتھ ووہرا کی مدت ختم ہو رہی تھی، دہلی میں ان کے ممکنہ جانشین کے بطور ریٹائرڈ لیفٹننٹ جنرل سید عطا حسنین کا نام گردش کر رہا تھا۔ جنرل حسنین جو سرینگر میں موجود فوج کی چنار یا ۱۵ویں کور کے کمانڈر رہ چکے تھے، کے کشمیر میں بطور گورنر کی ممکنہ تعیناتی پر میں چونک سا گیا تھا۔

ان ہی دنوں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں سرراہ ملاقات کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ اس خبر کا ماخذ کیا ہے؟ تو ان کا کہنا تھا کہ نہایت ہی اعلیٰ ذرائع سے ان کو بتایا گیا ہے کہ وہ اس عہدے کے لیے تیار رہیں۔

میں نے ان سے کہا، چاہے وہ کتنے ہی سیکولر کیوں نہ ہوں، ان کا نام مسلمانوں جیسا ہے، اس لیے وہ اس عہدہ کے تقاضوں پر پورے نہیں اترتے ہیں۔ اب ان کے چونکنے کی باری تھی۔ میں نے بتایا کہ جموں و کشمیر کا گورنر ویشنو دیوی شرائن بورڈ اور امرناتھ شرائن بورڈ کا چیئرمین بھی ہوتا ہے۔

ان دونوں تیرتھ استھانوں کے ایکٹ میں واضح طور پر درج ہے کہ اس کا چیئرمین ایک ہندو ہی ہوسکتا ہے۔ یہی ہوا کہ چند روز بعد ایک ہندوستیہ پال ملک کو گورنری کی دستار تفویض کی گئی۔ یعنی ایک مسلم اکثریتی خطہ ہونے کے باوجود جموں و کشمیر کا گورنر یا لیفٹننٹ گورنر مسلمان نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ وہ ہندو استھانوں کے انتظام و انصرام کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے۔

ستم ظریفی دیکھیے ابھی حال ہی میں بھارتی پارلیمان نے سو سال قدیم مسلم وقف قانون کو رد کرکے ایک نیا قانون پاس کرکے اس میں یہ لازم قرار دیا کہ مرکزی وقف کونسل اور ریاستی وقف بورڈز کے بیشتر اراکین غیر مسلم ہونے چاہئیں۔

سابقہ قانون کے تحت دونوں اداروں کے تمام اراکین کا مسلمان ہونا ضروری تھا۔ اب اس میں غیر مسلم اراکین کی لازمی شمولیت متعین کر دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ مرکزی وقف کونسل میں ۲۲ میں سے ۱۲ اراکین غیر مسلم ہوں گے اور ریاستی وقف بورڈز میں گیارہ میں سے ۷ اراکین غیر مسلم ہوسکتے ہیں۔ چار مسلم اراکین میں دو خواتین کا ہونا لازمی ہے۔

ان اراکین اور چیئرمین کو اب حکومت نامزد کرے گی۔ نیز ریاستی وقف بورڈ کے چیف ایگزیکٹو آفیسر کا بھی مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے۔ وقف جائیدادوں کے تنازعوں کا نپٹارا کرنے کے لیے قائم وقف ٹریبونل میں مسلم ماہر قانون کی موجودگی لازمی ہوتی تھی۔

اب ٹریبونل صرف ایک موجودہ یا سابقہ ڈسٹرکٹ جج اور ایک ریاستی افسر پر مشتمل ہوگا۔ مہاراشٹرا میں شری سائی بابا ٹرسٹ کا قانون کہتا ہے کہ جو افسر وہاں کام کرے گا، اسے سائی بابا کا عقیدت مند ہونا چاہیے اور اسے ڈیکلریشن دینا پڑتا ہے۔ اسی طرح دیگر ہندو یا دیگر مذاہب کے مٹھوں یا عبادت گاہوں کے انتظام و انصرام کے لیے اسی مذہب کا ہونا لازمی ہے، تاکہ وہ دل و جان اور عقیدہ کے ساتھ اس ادارے کی خدمت کر سکے۔

یہ نیا قانون کس قدر متعصّبانہ حد تک ظالمانہ ہے کہ اس کی ایک اور شق کے مطابق اب صرف ایسا شخص ہی وقف یا اسلامی مذہبی و فلاحی مقاصد کے لیے زمین یا جائیداد عطیہ کر سکتا ہے، جو کم از کم پانچ سال سے باعمل مسلمان ہونے کا ثبوت پیش کرے گا۔ وہ دینداری کا ثبوت کیسے فراہم کرے گا، اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ کیا کسی سند کی ضرورت ہوگی یا علماء کی تصدیق درکار ہوگی؟ اور یہ فیصلہ کون کرے گا کہ وہ پچھلے پانچ سال سے باعمل مسلمان ہے یا اسلام پر عمل پیرا ہونے کا معیار کیا ہے؟

یعنی یہ قانون غیر مسلموں کو وقف بورڈز میں شامل ہونے اور اس کا انتظام و انصرام چلانے کی اجازت دیتا ہے، مگر اگر وہ وقف کے کاموں کے لیے عطیہ دینا چاہیں گے، تو اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ تنگ نظری اور تعصب کی عینک پہن کر بنایا گیا، یہ قانون تضادات کا عجیب مجموعہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی متولی وقف جائیداد بیچتا ہے تو پہلے دو سال کی سزا تھی، اس کو اب چھ ماہ کر دیا گیا ہے۔

پہلے یہ جرم ناقابلِ ضمانت (نان بیل ایبل) تھا، اس کو قابلِ ضمانت (بیل ایبل) بنا دیا گیا ہے۔ اگر کسی جائیداد پر حکومت اور وقف بورڈ کا تنازع ہے، تو اب وہ وقف نہیں مانی جائے گی۔ کلکٹر ایسے معاملات میں اپنی رپورٹ ریاستی حکومت کو دے گا اور مالکانہ ریکارڈ میں تبدیلی کرے گا۔

دارالحکومت دہلی کے سینٹرل گورنمنٹ آفس کمپلیکس کا بیشتر حصہ جس میں خفیہ ایجنسی را سمیت سینٹرل بیورو آف انویسٹی گیشن سمیت کئی سرکاری اداروں کے صدر دفاتر وقف کی زمینوں پر تعمیر کیے گئے ہیں، اب ہمیشہ کے لیے وقف کی دسترس سے باہر ہو گئے ہیں۔

ایک بار انٹرویو کے دوران مسلم لیڈر اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے رکن مرحوم جاوید حبیب نے مجھے کہا تھا کہ بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ اس خطے کی جدید تاریخ کے پانچ بڑے واقعات میں سے ایک ہے۔

پہلا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، دوسرا ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں کانگریس کا نیا آئین اور سوراج کا مطالبہ، تیسرا ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور آزادی، چوتھا ۱۹۷۱ء میں بنگلا دیش کا وجود میں آنا، اور پانچواں ۱۹۸۴ء میں سکھوں کی مقدس عبادت گاہ گولڈن ٹمپل پر حملہ اور ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کا انہدام، جو دراصل اعتماد کا انہدام تھا۔

اگر وہ زندہ ہوتے تو ریاست جموں و کشمیر کی ۲۰۱۹ء میں خصوصی حیثیت کے خاتمہ اور اب ۲۰۲۵ء میں صدیوں سے مسلمانوں کی طرف سے وقف کی گئی زمینوں، جائیدادوں، جن سے مساجد، مدرسے اور متعدد تعلیمی اور رفاعی ادارے چلتے ہیں، کے مالکانہ حق پر شب خون مارنے، کو بھی اس فہرست میں شامل کر دیتے۔

بقول سابق رکن پارلیمنٹ محمد ادیب، بابری مسجد تو بس ایک عبادت گاہ تھی، اب تو اس نئے وقف قانون سے بھارت کی سبھی مساجد و درگاہوں کا مستقبل داؤ پر لگ گیا ہے۔

پچھلی دو دہائیوں سے سکھ اکثریتی صوبہ پنجاب سے اکثر خبریں آتی تھیں کہ مقامی سکھ خاندان یا کسان اپنے علاقوں میں ۱۹۴۷ء سے غیر آباد مساجد کو دوبارہ آباد کرانے یا نئی مساجد بنانے کے لیے اپنی زمینیں بطور عطیہ دے رہے ہیں۔ اس طرح کے کم و بیش دو سو سے زیادہ واقعات رپورٹ ہوئے ہیں۔

چونکہ اس صوبہ میں مسلم آبادی ہی ایک فیصد سے کم ہے، اس لیے مسلمان ان مساجد کو آباد کر ہی نہیں سکتے ہیں، کیونکہ

اکثر دیہی علاقوں میں دور دور تک ان کی آبادی ہی نہیں ہے۔ رواں برس کے اوائل میں ہی ضلع مالیر کوٹلہ کے ایک گاؤں عمر پورہ میں سکھ جندر سنگھ نونی اور ان کے بھائی اَوی نندر سنگھ نے مسجد کی تعمیر کے لیے کئی ایکڑ زرعی زمین وقف کر دی۔

ان کا کہنا تھا کہ چونکہ ان کے گاؤں میں آباد مسلمان گھرانوں کے پاس عبادت کے لیے کوئی مسجد نہیں تھی، اس لیے انہوں نے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے یہ زمین عطیہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ دیگر سکھوں تجونت سنگھ اور رویندر سنگھ گریوال نے مسجد کی تعمیر میں مالی معاونت فراہم کی۔

وہ ریاست جہاں مسلمانوں کی آبادی محض ۹ء۱ فیصد ہے اور جہاں ۱۹۴۷ء میں خونریز فسادات ہوئے تھے، اب ایک خاموش انقلاب، یعنی فرقہ وارانہ رواداری کی نقیب بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح جٹوال کلاں نامی سکھ اکثریتی گاؤں میں، جہاں مشکل سے درجن بھر مسلم گھرانے آباد ہیں، ایک نئی مسجد تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ یہ سب سکھوں کی زمین اور مالی عطیات کی بدولت ممکن ہوا۔

اب نئے وقف قانون کی رو سے پنجاب میں سکھ خاندانوں کی جانب سے مسلمانوں کے لیے عطیہ کی گئی سیکڑوں زمینیں کالعدم یا غیر قانونی قرار پائیں گی۔ ایک سکھ سرپنچ کے مطابق اگر یہ قانون پہلے سے نافذ ہوتا تو وہ مسجد بنانے میں مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ معاملہ صرف عطیہ کا نہیں، بلکہ مشترکہ زندگیوں کا ہے اور حکومت ایسی یکجہتی کی راہ میں کیسے رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق بھارت میں وقف کی ۸ لاکھ ۷۲ ہزار جائیدادیں ہیں، جن میں زرعی اور غیر زرعی زمینیں، ایک لاکھ سے زائد مساجد، مکانات اور تیس ہزار کے قریب درگاہیں شامل ہیں۔ جن میں سے ۷ فیصد پر قبضہ ہے، ۲ فیصد مقدمات میں ہیں اور ۵۰ فیصد کی حالت نامعلوم ہے۔ ۲۰۱۳ء میں منموہن سنگھ کی قیادت میں کانگریسی حکومت نے وقف پراپرٹی پر قبضوں کے خلاف جو سخت قانون بنایا تھا، اس کی وجہ سے ۲۱ لاکھ ایکڑ کی زمین واگزار کرائی گئی تھی۔

اس طرح وقف کی ملکیتی زمینیں ۱۸ لاکھ ایکڑ سے ۳۹ لاکھ ایکڑ تک بڑھ گئی تھیں۔ ہندو فرقہ کو لام بند کرنے کے لیے ایک پروپیگنڈا کیا گیا کہ مسلمانوں نے زمینوں پر قبضہ کیا ہوا ہے اور ساتھ ہی یہ ابہام بھی پھیلایا گیا کہ بھارت میں ریلوے اور محکمہ دفاع کے بعد سب سے زیادہ جائیداد وقف کی ہے۔

حالانکہ سچ یہ ہے کہ صرف چار ریاستوں تامل ناڈو، آندھرا پردیش، تلنگانہ اور اڑیسہ میں ہندو مٹھوں و مندروں کے پاس ۱۰ لاکھ ایکڑ اراضی ہے۔ اگر اس میں دیگر ریاستیں، خاص طور پر شمالی بھارت کی اتر پردیش اور بہار کو شامل کیا جائے تو یہ وقف کے پاس موجود اراضی سے کئی گنا زیادہ ہوں گی۔ اسی طرح مسیحی برادری بھی ہر شہر میں پرائم پراپرٹی کی مالک ہے۔

سیاسی تجزیہ کار سنجے کے جھا نے 'دی وائر' میں لکھا کہ یہ قانون دراصل فرقہ وارانہ شکوک پیدا کرنے کی بڑی سازش کا حصہ ہے، جسے حکومت عوام کی بھلائی کے نام پر پیش کر رہی ہے۔ مودی حکومت کا یہ دعویٰ کہ یہ وقف بل مسلمانوں کی فلاح کے لیے لایا گیا ہے، بھارت کی تاریخ کا بدترین سیاسی فریب ہے۔ اس جھوٹ کو بیچنے کا جو حوصلہ حکومت نے دکھایا ہے، وہ ناقابل یقین ہے۔ ان کا مقصد مسلمانوں کو تنہا اور الگ تھلگ کرنا ہے۔ اس قانون کے اثرات پنجاب سے کہیں آگے تک ہیں۔ پورے بھارت میں اب بین المذاہب خیرات شک کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

کوئی ہندو یا سکھ اگر کسی مسلم وقف ادارے کو عطیہ دینا چاہے تو پہلے اُسے مذہب تبدیل کرنا ہوگا اور پانچ سال انتظار کرنا پڑے گا۔ یوں خیرات کا جذبہ سرکاری دھندلکوں میں الجھ کر رہ جائے گا۔ ایسی حکومت، جس کے پاس ایک بھی مسلم رکن پارلیمنٹ نہیں، مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے راگ الاپتی ہے، جبکہ اس کا سیاسی ڈھانچا نفرت انگیز تقاریر، حاشیے پر ڈالنے والی پالیسیوں اور مسلمانوں کو قانونی جال میں جکڑنے کی مہم چلا رہا ہے۔

عمر پورہ اور جٹوال کلاں جیسے دیہاتوں میں سکھ اور مسلمان آج بھی مل کر بستیاں بساتے ہیں۔ مگر قانون کی نظر میں اب ان کی محبت اور بھائی چارہ قابلِ گرفت بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اب کسی بھی زمین کو وقف تسلیم کرنے کے لیے اس کی باضابطہ رجسٹریشن اور متعلقہ دستاویزات درکار ہوں گی۔

اب اگر سلاطین، تغلق یا مغل دور میں کوئی زمین وقف ہوئی ہو، اس کی دستاویزات کہاں سے لائی جائیں گی۔ جموں و کشمیر وقف بورڈ کے اعداد و شمار کے مطابق، اس کے زیرِ انتظام ۳۳۰۰ جائیدادیں تقریباً ۳۲ ہزار کنال (تقریباً ۴ ہزار ایکڑ) زمین ہے۔ تاہم ایک بڑا حصہ۔۔۔ خصوصاً خانقاہیں، امام بارگاہیں، لنگر گاہیں اور قبرستان۔۔۔ ابھی تک غیر دستاویزی یا جزوی طور پر رجسٹرڈ ہیں۔

دیہی کشمیر میں ان مقامات کی بنیاد کئی نسلیں پہلے رکھی گئی تھی، اور انہیں رسمی قانونی طریقۂ کار کے بجائے کمیونٹی کے مسلسل استعمال کے ذریعے سند حاصل ہوئی تھی۔ ''استعمال کے ذریعے وقف'' یعنی ''وقف بائی یوز'' کی شق کے خاتمے کے بعد، یہ مقامات اب دوبارہ درجہ بندی، تنازع یا حتیٰ کہ دوبارہ استعمال کے خطرے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ قانونی تحفظ، جو کبھی تسلسل اور اجتماعی یادداشت سے حاصل ہوتا تھا، اب مکمل طور پر تحریری دستاویزات پر منحصر ہو گیا ہے۔

تاریخی طور پر کشمیر میں۔۔۔ جیسے کہ برصغیر کے بیشتر حصوں میں۔۔۔ مذہبی اور فلاحی زمینیں اکثر باہمی اعتماد اور زبانی معاہدوں کی بنیاد پر قائم ہوتی تھیں۔ جہاں بزرگ کسی درخت تلے نماز پڑھنے بیٹھتے، وہاں مسجد وجود میں آ جاتی۔ جہاں کسی گاؤں کے پہلے شہید کو دفنایا جاتا، وہاں قبرستان بن جاتا۔ اور جہاں کوئی صوفی اپنی جائے نماز بچھاتا، وہاں خانقاہ کی بنیاد پڑتی۔

'استعمال کے ذریعے وقف' کا اصول ایسے مقامات کو قانونی حیثیت دیتا تھا، چاہے کوئی تحریری ثبوت موجود نہ ہو۔ نیا قانون محض کوئی سرکاری ضابطے کی تبدیلی نہیں بلکہ ایک گہری تہذیبی تبدیلی ہے۔ کشمیر کے بیشتر علاقوں میں بے شمار قبرستان، خانقاہیں اور دینی مدارس مقامی افراد، محلوں یا گاؤں کی کمیٹیوں کے ذریعے چلائے جا رہے ہیں، جن کے پاس کوئی تحریری دستاویزات نہیں، مگر خدمت کے طویل اور بے داغ ریکارڈ ضرور ہیں۔

نیا قانون ان جائیدادوں پر ریاستی اداروں یا نجی ترقیاتی منصوبوں کے قبضے کا راستہ ہموار کر سکتا ہے، خصوصاً جدید کاری یا شہری منصوبہ بندی کے نام پر۔ دفعہ ۳۷۰ کی منسوخی اور مرکزی انتظام کے بعد، اس اقدام کو کشمیر کے مزید ذہنی، ثقافتی اور سیاسی زوال کا حصہ سمجھا جا رہا ہے۔ کبھی ان جائیدادوں کا محافظ سمجھے جانے والا جموں و کشمیر وقف بورڈ اب بے دست و پا نظر آتا ہے۔

وقف ترمیمی قانون کی منظوری نے اتر پردیش میں تقریباً ۹۸ فیصد وقف جائیدادوں کو غیر یقینی صورتحال سے دوچار کر دیا ہے۔ وقف کی پوری جائیدادوں کا ۲۷ فیصد حصہ اسی صوبہ میں ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد اب تک ریونیو ریکارڈز میں درج نہیں ہے۔

نئے قانون کے تحت وقف جائیدادوں کے فیصلے کا اختیار وقف بورڈ سے منتقل ہو کر اب ضلع مجسٹریٹ کے پاس ہوگا، جو زرعی سال ۱۳۵۹ھ (۱۹۵۲ء) کے ریونیو ریکارڈز کی بنیاد پر فیصلہ دیں گے۔ ترمیم کا اطلاق ان ۵۷,۷۹۲ سرکاری

جائیدادوں پر ہوگا جو مختلف اضلاع میں پھیلی ہوئی ہیں اور مجموعی طور پر ۱۲۱۷,۱۱/۱ ایکڑ پر محیط ہیں۔

تیس سے زائد مسلم دانشوروں، جن میں سابق بیوروکریٹ، یونیورسٹی اساتذہ، قانون دان، سیاستدان وغیرہ شامل ہیں، نے ایک مشترکہ بیان میں شکایت کی ہے کہ پارلیمنٹ کی طرف سے وقف ایکٹ کی منظوری نے مسلم کمیونٹی کو مایوس اور الگ تھلگ کر دیا ہے۔

ان کے مطابق آئین ہند میں دیے گئے ان کے آئینی حقوق نظرانداز کر دیے گئے ہیں۔ اس عمل نے مسلم نوجوانوں میں بیگانگی کا احساس پیدا کیا ہے، جو اَب اپنے ملک کے سیاسی منظرنامے میں اپنی جگہ کے بارے میں سوالات اٹھا رہے ہیں۔ اس گروپ میں جس میں کئی سابق اعلیٰ فوجی افسران، جیسے لیفٹننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ، سابق پولیس سربراہ محمد وزیر انصاری شامل ہیں، کا کہنا ہے کہ موجودہ حالات دل دہلا دینے والے ہیں اور ان کے آباؤ اجداد کے وژن کے بالکل برعکس ہیں، جنھوں نے جامع مشترکہ قومیت کا تصور کیا تھا جہاں تمام اقوام ہم آہنگی کے ساتھ رہ سکیں گی۔

حیدر آباد کے ممبر پارلیمنٹ اور آل انڈیا مجلس اتحاد المسلمین کے سربراہ اسدالدین اویسی کے مطابق یہ وقف ترمیمی ایکٹ بھارت کے مسلمانوں کے ایمان اور عبادت پر ایک حملہ ہے۔ پارلیمنٹ میں اپنی تقریر میں انہوں نے کہا کہ نریندر مودی کی حکومت نے اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے اور یہ جنگ آزادی، سماجی و معاشی سرگرمیوں اور شہریت پر تو تھی ہی، اب مدارس، مساجد، خانقاہوں اور درگاہوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

ہندو، سکھ، جین اور بدھ مت کے ماننے والوں کی وقف کی گئی جائیدادوں کا تحفظ برقرار رہے گا، کیونکہ ان کے قوانین کو تحفظ حاصل ہے اور ان کا انتظام خود ان کے ہاتھوں میں ہے۔ کوئی بھی غیر مذہب ان کے لیے عطیہ دے سکتا ہے اور ان کے انڈومنٹس کا تحفظ ہوگا۔ ان پر لاء آف لیمٹیشن کا اطلاق نہیں ہوگا۔

اویسی کا کہنا تھا کہ مسلمانوں سے وقف بائی یوزر چھینا گیا ہے، مگر دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے لیے چھوٹ ہے۔ ہندو، بدھ، سکھ مذاہب کو منقولہ و غیرمنقولہ جائیداد کو حاصل کرنے اور اس کے انتظام کا حق حاصل ہے، مگر صرف مسلمانوں سے یہ حق چھینا گیا ہے۔

دہلی میں ۱۷۲ وقف جائیدادیں محکمۂ آثارِ قدیمہ کے کنٹرول میں ہیں۔ یہ جائیدادیں اب عملی طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئی ہیں، کیونکہ ان کی پاس ان کے مالکانہ حقوق کے دستاویزی ثبوت موجود نہیں ہیں۔

اس میں شمالی بھارت کی سب سے پہلی قطب الدین ایبک کی تعمیر کردہ تاریخی مسجد قوت الاسلام بھی ہے، جو قطب مینار کے بغل میں واقع ہے۔ چونکہ تنازع کی صورت میں حکومت کے ہی افسر کو فیصلہ کرنا ہے، اسی لیے ایسی صورتوں میں جہاں تنازع حکومت کے کسی محکمہ کے ساتھ ہے، تو اس پراپرٹی کا خدا ہی حافظ ہے۔ وقف بائی یوزر میں جب کوئی افسر کہہ دے گا کہ یہ وقف کی جائیداد نہیں ہے، تو وقف بورڈ خاموش بیٹھ جائے گا اور کوئی کارروائی نہیں کرے گا، کیونکہ ان کے چیئرمین حکومت کے نامزد کردہ ہوں گے۔

اس قانون کے ذریعے شاید مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ ان کی حالت ایسی ہو چکی ہے جیسے جنگل میں چرواہا بکریوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور ان کی دیکھ بھال بھیڑیوں کے سپرد کر دی گئی ہے، جو اس کو شیر سے بچانے کے نام پر خود نوچ رہے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ وسط ایشیاء پر روس کے قبضے کے بعد سب سے پہلے اوقاف ضبط کیے گئے تھے، تاکہ مساجد اور مدرسوں کے وسائل ختم کرائے جائیں۔ جب عوام نے چندہ جمع کر کے مسجدیں چلانا شروع کیں، تو چندہ ٹیکس لگایا گیا۔

لوگوں نے اب گھروں میں نمازیں ادا کرنا شروع کیں، مساجد ویران ہو گئیں۔ مقامی کمیونسٹ پارٹی کے یونٹ قرارداد پاس کرتے کہ مسجد ویران ہے، اس لیے اس کو رفاعی کاموں کے لیے مختص کیا جائے۔ اس طرح مسجد کو شہید کروایا جاتا اور کسی اور تصرف میں لایا جاتا۔

ایک چیز خوش آئند ہے کہ بھارتی مسلم زعما کو یہ بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ ان کو کنارے لگایا گیا ہے۔ ورنہ جب ان سے درخواست کی جاتی کہ کشمیر میں ہو رہے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر کچھ ہونٹ تو ہلائیں، تو ان کے منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا تھا۔

سال ۲۰۱۹ء میں جب خصوصی حیثیت ختم کر دی گئی، تو جمعیت علماء ہند کے ایک ذمہ دار تو جنیوا مودی حکومت کا دفاع کرنے پہنچ گئے۔ ایک آدھ ملی رہنماؤں کو چھوڑ کر ان میں اکثر مارٹن نیمولر کی اس نظم کی عملی تفسیر تھے۔

پہلے وہ سوشلسٹوں کے پیچھے آئے، اور میں خاموش رہا۔۔۔ کیونکہ میں سوشلسٹ نہیں تھا۔

پھر وہ ٹریڈ یونین کے کارکنوں کے پیچھے آئے، اور میں خاموش رہا۔۔۔ کیونکہ میں ٹریڈ یونین کا کارکن نہیں تھا۔

پھر وہ یہودیوں کے پیچھے آئے، اور میں خاموش رہا۔۔۔ کیونکہ میں یہودی نہیں تھا۔

پھر وہ میرے پیچھے آئے۔۔۔ اور بولنے والا کوئی نہ بچا تھا۔

شاید بھارت میں مسلمان ابھی تک خوش قسمت ہیں کہ ایک ذی ہوش طبقہ ابھی بھی ان کے ساتھ کھڑا ہے۔ ان کو ساتھ لے کر ہی ان کی دادرسی ہو سکتی ہے اور ان کی عبادت گاہوں کو تحفظ فراہم ہو سکے گا۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۷/اپریل ۲۰۲۵ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی مطبوعات... ہر گھر، ہر خاندان کے لیے!

قرآن کا نظامِ خاندان	40/=	اِصلاحِ معاشرہ	600/-	معمارِ جہاں تو ہے	1000/-
مسلمان عورت کے حُقوق	200/=	اسلام کا عائلی نِظام	250/=	خَانگی زندگی اور اُسوۂ حَسَنہ	100/=
عورت اور اسلام	150/=	تحریکِ حقوقِ نسواں	300/=	خاندان کو لاحق خطرات اور ممکنہ لائحۂ عمل	60/=
مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	100/=	بچّوں کے ذہنی اَمراض	400/=	گھریلو تشدّد اور اسلام	60/=
بچّے اور اسلام	40/=	بچّوں میں خوف	150/=	زندگی کے عام فقہی مسائل (جلد اوّل تا پنجم)	2500/-
انقلابی کتاب	250/=	آزاد بچّے، آزاد والدین	500/=	مَردوں کا جہاں اور ہے عورتوں کا جہاں اور	500/=

اکیڈمی بک سینٹر۔ ڈی ۳۵، بلاک ۔۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی فون: ۳۶۳۴۹۸۰۲۰

ابتہال ابو السعد

مائیکروسافٹ کو اصل چہرہ دکھانے والی توانا آواز

''آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ مصنوعی ذہانت کو اچھائی کے لیے استعمال کرتے ہیں، لیکن مائیکروسافٹ اسرائیلی فوج کو مصنوعی آلات فروخت کر رہا ہے جن کی مدد سے صہیونی فوج فلسطینیوں کی نسل کشی کر رہی ہے''۔

یہ حق گوئی کے الفاظ مراکشی نژاد ابتہال ابوسعد کے ہیں جو امریکی ٹیکنالوجی کمپنی 'مائیکروسافٹ' سے منسلک ہیں۔ ان کے یہ الفاظ نہ صرف کمپنی کو گراں گزرے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ صہیونیت نوازوں پر بم بن کر گرے ہیں۔ انہوں نے کمپنی کے مصنوعی ذہانت کے پروگرام کے شامی نژاد برطانوی مصطفیٰ سلیمان کو بھی آئینہ دکھایا اور ان کا اصل چہرہ پوری دنیا کے سامنے بے نقاب کرتے ہوئے دنیا کو بتایا کہ مصطفیٰ سلیمان کس طرح کمپنی کے دفاع کا جھوٹا پروپیگنڈہ کر کے صہیونیوں کی آشیر باد حاصل کرنے کی گھٹیا کوشش کر رہا ہے۔

اگرچہ ابتہال کا مؤقف صیہونی مجرم جنگی مشین کی حمایت میں مصنوعی ذہانت کی کمپنیوں کے جرائم کے بارے میں کوئی نئی بات نہیں مگر یہ غزہ اور فلسطینی عوام کے ساتھ اخلاقی یکجہتی اور ان کے خلاف ہونے والے عمل کے سب سے اعلیٰ اظہار میں سے ایک ہے۔ ایک کمزور لڑکی کا دوٹوک انداز میں کمپنی کی فلسطینیوں کی نسل کشی میں سہولت کاری کو آشکار کرنا عالمی اداروں کی اخلاقی ذمہ داری کے حوالے سے بھی ایک پیغام ہے۔

ابتہا ابوسعد نے مصطفیٰ سلیمان اور مائیکروسافٹ کے سامنے یہ حق گوئی ایک ایسے وقت میں کی جب مصطفیٰ سلیمان ایک بڑے پروگرام میں کمپنی کی ٹیکنالوجی اور اس کی مصنوعی ذہانت کے آلات کی تعریف کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس موقع پر ابتہال نے اسے یاد دلایا کہ کس طرح مائیکروسافٹ صہیونی فوج کو جاسوسی کے آلات اور مصنوعی ذہانت کے پروگرام فراہم کر کے فلسطینیوں کی نسل کشی میں غاصب صہیونیوں کی مدد کر رہی ہے۔

مائیکروسافٹ کے تمام ملازمین کو بھیجی گئی ایک ای میل میں اس نے اپنے احتجاج کی وجوہات بیان کیں انہوں نے کہا کہ ''میرا نام ابتہال ہے اور میں مائیکروسافٹ میں مصنوعی ذہانت پلیٹ فارمز ڈویژن میں ۳-۵ سال سے سافٹ ویئر انجینئر ہوں۔ میں نے آج بات کی کیوں کہ میں نے دریافت کیا کہ کمپنی فلسطین میں میرے لوگوں کی نسل کشی کو فروغ دے رہی ہے''۔

انہوں نے مائیکروسافٹ اور اسرائیلی وزارت دفاع کے درمیان ۱۳۳ ملین ڈالر کے معاہدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا، ''اسرائیلی فوج کی جانب سے مائیکروسافٹ کی مصنوعی ذہانت کے استعمال میں گزشتہ ۷/اکتوبر سے پہلے کے مقابلے میں ۲۰۰ گنا اضافہ ہوا ہے''۔

ابتہال نے وضاحت کی کہ: ''مائیکروسافٹ، سافٹ ویئر کی فراہمی، کلاؤڈ سروسز اور اسرائیلی فوج اور حکومت کو مشاورتی سروس فراہم کر کے لاکھوں ڈالر کماتا ہے''۔

ابتہال کے مؤقف کی اہمیت

ڈیجیٹل میڈیا کے ماہر سعید حسونہ نے لکھا کہ ''ابتہال ابو السعد کا اسرائیل کے ساتھ مائیکروسافٹ کی ملی بھگت کو بے نقاب کرنے میں لیا گیا مؤقف کچھ بڑی ٹیک کمپنیوں کے پوشیدہ طریقوں اور انسانی حقوق پر ان کے اثرات کے بارے میں مقامی اور بین الاقوامی رائے عامہ میں بیداری پیدا کرنے میں بہت اہمیت کا حامل ہے''۔

شہاب نیوز ایجنسی کے مطابق حسونہ نے مزید کہا کہ ''ابو السعد کے مؤقف نے عالمی ٹیکنالوجی کمپنیوں اور فلسطینیوں کے خلاف قابض اسرائیل کے خلاف ورزیوں کے درمیان تعلقات پر روشنی ڈالنے میں مدد کی ہے۔''

انہوں نے یہ واضح مؤقف عالمی کارپوریٹ سماجی ذمہ داری سے متعلق بنیادی مسائل کو اٹھانے کے لیے سوشل میڈیا پلیٹ فارم کو مؤثر طریقے سے استعمال کرنے کی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ڈیجیٹل میڈیا ماہر نے کہا کہ ''اس قسم کا انفرادی مؤقف دوسروں کو افراد اور گروہوں، دونوں کو اسی طرح کے اقدامات کرنے اور بڑے اداروں پر دباؤ ڈالنے کے لیے وسیع تر منظم مہمات شروع کرنے کی ترغیب دے سکتا ہے۔ یہ قابض ریاست اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی حمایت میں ان کی ذمہ داری کے لیے قانونی اور میڈیا کے لحاظ سے جوابدہ ٹھہرایا جا سکتا ہے''۔

حسونہ نے سوشل میڈیا کے منظم استعمال کی حوصلہ افزائی کرنے پر زور دیا۔ واضح دستاویزات اور شواہد کی مدد سے اثر و رسوخ اور جوابدہی کے دائرے کو وسعت دینے کی ترغیب کی ہے۔ اس طرح کی ملی بھگت کو بے نقاب کرنے کے لیے سوشل میڈیا صارفین اور میڈیا کے پیشہ ور افراد کے درمیان تعاون کو بڑھانے پر زور دیا۔

مکمل واقعہ

فلسطینی حامی ملازمہ ابتہال ابوسعد نے مائیکروسافٹ کے مصنوعی ذہانت کے 'سی ای او' مصطفیٰ سلیمان کی اسرائیل کے ساتھ کمپنی کے تعلقات پر احتجاج کرتے ہوئے تقریر میں خلل ڈالا۔ یہ ٹیک انڈسٹری کی طرف سے اسرائیلی فوج کو مصنوعی ذہانت کی ٹیکنالوجی کی فراہمی کے خلاف تازہ ترین ردعمل ہے، جس نے کمپنی کی پچاسویں سالگرہ کی تقریبات میں خلل ڈالا ہے۔

مائیکروسافٹ کے ملازم ابتہال ابوالسعد نے سی ای او مصطفیٰ کی تقریر میں خلل ڈالتے ہوئے کہا، ''تمہیں شرم آنی چاہیے، جس کے بعد مصطفیٰ نے اپنی تقریر ادھوری چھوڑ دی۔

ابتہال نے مزید کہا ''آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ مصنوعی ذہانت کو اچھے کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں، لیکن مائیکروسافٹ اسرائیلی فوج کو مصنوعی ذہانت کے ہتھیار فروخت کر رہا ہے۔ ۵۰ ہزار افراد شہید ہو چکے ہیں۔ مائیکروسافٹ ہمارے خطے میں اس نسل کشی کی مدد کر رہا ہے''۔

مائیکروسافٹ کی ایک دوسری ملازمہ وانیہ اجروال نے تقریب کے ایک اور حصے میں اس وقت خلل ڈالا جب گیٹس، بالمرا اور موجودہ سی ای او ستیہ نڈیلا اسٹیج پر تھے۔

تحقیقات سے مصنوعی ذہانت کی علم بردار کمپنیوں کے جرائم کا انکشاف

اس سال کے شروع میں ایسوسی ایٹڈ پریس کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ مائیکروسافٹ اور 'اوپن اے آئی' کے مصنوعی ذہانت کے ماڈلز کو غزہ اور لبنان میں حالیہ جنگوں کے دوران بمباری کے اہداف کو منتخب کرنے کے لیے اسرائیلی فوجی پروگرام کے حصے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

اس تحقیق میں ۲۰۲۳ء کے غلط اسرائیلی فضائی حملے کی تفصیلات بھی شامل ہیں جس نے ایک کار کو نشانہ بنایا تھا جس میں ایک لبنانی خاندان کے افراد شامل تھے، جس میں تین نوجوان لڑکیاں اور ان کی دادی شہید ہو گئی تھیں۔

فروری میں مائیکروسافٹ کے پانچ ملازمین کو اسرائیل کے ساتھ معاہدوں پر احتجاج کرنے پر نادیلا کے ساتھ

ملاقات سے نکال دیا گیا تھا۔

مائیکروسافٹ میں اس کی اعلیٰ پروفائل اور تنخواہ کے باوجود مراکش کے ابتہال ابوالسعد نے ان سب کو مسترد کر دیا۔ وہ کمپنی کی سالانہ تقریب میں سب کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ نسل کشی اور مصنوعی ذہانت کے شعبے میں قابض ریاست کے ساتھ کمپنی کے تعاون کو مسترد کرتی ہے۔

مائیکروسافٹ کی قابض اسرائیلی فوج کی جنگی اور انٹیلی جنس سرگرمیوں کی معاونت

برطانوی اخبار ''گارڈین'' نے ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع کی جس میں اس بات کی تصدیق کی گئی کہ امریکی کمپنی مائیکروسافٹ نے غزہ کی جنگ کے دوران تکنیکی مدد فراہم کرنے کے لیے قابض اسرائیلی فوج کے ساتھ اپنے تعلقات کو مضبوط کیا۔

اخبار نے وضاحت کی کہ مائیکروسافٹ کی مصنوعات اسرائیلی فضائی، زمینی اور بحری افواج کے یونٹوں کے ذریعے استعمال کی جاتی ہیں۔ اسرائیلی وزارت دفاع نے مائیکروسافٹ کو انتہائی حساس اور خفیہ منصوبوں پر کام کرنے کا حکم دیا تھا۔

تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی کہ غزہ جارحیت کے شدید ترین مرحلے کے دوران مائیکروسافٹ کی کلاؤڈ اور اے آئی ٹیکنالوجی پر اسرائیلی فوج کا انحصار بڑھ گیا تھا اور ہزاروں گھنٹے تکنیکی مدد فراہم کرنے کے لیے کم از کم ۱۰ ملین ڈالر کے معاہدوں پر دستخط کیے گئے۔

اسرائیلی وزارت دفاع کے ایک ''قابل اعتماد پارٹنر'' کے طور پر مائیکروسافٹ کو اکثر انتہائی حساس اور درجہ بند منصوبوں پر کام کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ کمپنی نے اسرائیلی فوج کو OpenAI کے GPT-4 ماڈل تک وسیع رسائی فراہم کی ہے۔ مصنوعی ذہانت ٹول ڈویلپر کے ساتھ شراکت داری کی بدولت اس نے حال ہی میں فوجی اور انٹیلی جنس کلائنٹس کے ساتھ تعاون کی اجازت دینے کے لیے اپنی پالیسیوں میں تبدیلی کی ہے۔

ابتہال ابوالسعد کون ہے؟

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابتہال ابوسعد مراکش کی انجینئر اور پروگرامر ہیں، جو ۱۹۹۹ء میں مراکش کے دارالحکومت رباط میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے وہاں تعلیم حاصل کی۔ ۲۰۱۷ء میں مولائے یوسف ہائی اسکول سے ریاضی میں ڈگری حاصل کی۔ پھر اسے ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے اسکالرشپ ملا۔ انہوں نے ہارورڈ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد مصنوعی ذہانت میں مہارت حاصل کی اور مائیکروسافٹ میں کام کیا۔

ایک ایسے وقت میں جب بہت سے لوگوں نے ملازمت بچانے اور زیادہ تنخواہوں کے لیے اپنے ضمیر بیچ دیے ہیں، ابتہال نے مائیکروسافٹ کے ساتھ ملازمت کو پاؤں کی ٹھوکر رسید کی۔

ابتہال کا پیغام پوری دنیا کے تمام طبقات کے لیے ہے۔ اس نے جو جرأت دکھائی ہے، وہ بڑی بڑی حکومتیں دکھانے سے قاصر ہیں۔ ابتہال کا جرأت مندانہ مؤقف نام نہاد عالمی انسانی حقوق کے علم برداروں کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے۔ فلسطینیوں کی نسل کشی پر خاموش تماشائی نام نہاد مسلمان حکومتوں کو ابتہال سے عبرت سیکھنی چاہیے۔

(بحوالہ: ''مرکز اطلاعات فلسطین''۔ ۱۷ اپریل ۲۰۲۵ء)

غزہ جنگ کون جیتے گا؟

منصور جعفر

غزہ میں جاری اسرائیلی جنگ کے پرت کھلنے کا سلسلہ جاری ہے۔ جن سے یہ اب زیادہ صاف دِکھنے لگا ہے کہ غزہ میں فلسطینیوں کے خلاف ایک تباہ کن جنگ اسرائیل اور اس کی فوج نے لڑی ہے۔ لیکن اس کے اصل کرداروں کا تاریخ جب تعین کرے گی تو امریکا و اتحادیوں کے نام نمایاں ہوں گے۔

ایسا اس حقیقت کے باوجود ہوگا کہ امریکا جنگ نہ لڑ کر جیتنے اور لڑ کر ہار جانے کا ایک وسیع تجربہ رکھتا ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال افغانستان کی ہے۔ امریکا نے سوویت یونین کے خلاف جنگ پاکستان کے اداروں اور عسکری وژن و مہارت سے جیتی۔ سوویت یونین کے خلاف جنگ میں امریکا براہ راست شریک نہ تھا۔ بلکہ پاکستان اور اس کے اداروں اور افغان مجاہدین نے لڑی تھی۔ مگر جب سوویت یونین کو شکست کے بعد دریائے آمو کے پار واپس جانا پڑا تو امریکا نے بڑی خوبصورتی سے اس جنگ کی فتح کا کریڈٹ اپنے نام کرلیا اور پاکستان کے حصے میں دہشت گردی ڈال دی۔

نائن الیون کے بعد افغانستان میں امریکی جنگ تھی۔ مگر بیس سال پر پھیلی اس تباہ کن جنگ اور امریکی قیادت کے لیے بھی مہلک جنگ کے باوجود اگست ۲۰۲۱ء کو جس طرح امریکا کو انخلا کرنا پڑا، اسے امریکی فتح قرار نہیں دیا جاسکتا۔

لیکن جس طرح غزہ میں امریکی سرپرستی میں امریکی اسلحے کے ساتھ اسرائیل نے جنگی تباہ کاری کی بدترین مثال قائم کی اور بعد ازاں جنگ بندی کا پہلا مرحلہ ہونے پر از سرنو امریکی مشورے و تائید کے ساتھ دوبارہ جنگ مسلط کی ہے۔ اس سے بھی اس جنگ کی حتمی فتح یا شکست کا کریڈٹ امریکا کو دیے بغیر مؤرخین آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ یوں افغان جنگ کی ناکامی اگر جو بائیڈن نے اپنے اور ڈیموکریٹس کے کھاتے میں ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا تو صدر ٹرمپ جو جنگیں ختم کروانے کے نعروں کے دوش پر دوبارہ وائٹ ہاؤس پہنچے ہیں، وہ بھی اس غزہ جنگ کی فتح یا شکست کا حتمی تمغہ سجائے بغیر وائٹ ہاؤس سے نہیں جائیں گے۔

امریکا غزہ جنگ لڑنے کا براہ راست کریڈٹ اور ٹائٹل لے یا نہ لے، وہ اس جنگ کی جیت کا تمغہ افغانستان کے بعد ضرور اپنے سینے پر سجانے کا خواہاں ہے۔ اس لیے اگر اسرائیل جیتا تو امریکا اپنی جیت کے طور پر پیش کرنے کی خواہش ضرور رکھے گا تاکہ یورپ اور مشرق پر اپنی بالادستی اور غلبے کو ایک بار پھر راسخ ظاہر کر سکے۔

اب تک ۵۳۰ دنوں پر پھیل چکی اس غزہ جنگ کے ساتھ ساتھ ٹرمپ کے امریکی صدر بننے کے بعد ایک اور اہم پرت یہ کھل کر سامنے آیا ہے کہ وہ غزہ سے فلسطینیوں کے 'مکمل' صفائے کا اعلان ہے۔ جس کا اظہار صدر ٹرمپ نے وائٹ ہاؤس میں دوبارہ پہنچ کر ابتدائی دنوں میں ہی کر دیا تھا۔ مصر اور اردن اور بعض دیگر مقامات پر فلسطینیوں کی غزہ سے لاکھوں کی تعداد میں منتقلی اس پرت کی ادھوری کہانی ہے۔

اس پرت کا دوسرا حصہ جو کہ اصلاً اس کا پہلا حصہ ہے وہ اس کے پیچھے موجود سوچ پر مبنی ہے۔ یہ سوچ صدر ٹرمپ کے پہلے دور صدارت میں ۲۰۱۷ء میں سامنے آئی تھی۔ جب ایک تعمیراتی کمپنی نے اس ویژن کو Connected Gaza کے نام سے پیش کیا تھا۔ مسلسل اسرائیلی آتش و آہن کی زد میں رہنے والے اس غزہ کو جسے امریکا کے زیر سرپرستی فیصلے اور اقدام کرنے والے اسرائیل نے ناکہ بندیوں سے مسلسل دنیا سے کاٹ رکھا ہے، اس کے لیے ایک تعمیراتی کمپنی Connected Gaza کے تصور کو سامنے لانا حیران کن تھا۔

حیران کن اس لیے کہ اگر یہ فطری سوچ اور درست سمت میں فیصلے کی بنیاد پر سامنے آتی تو اہل غزہ کو کم از کم مغربی کنارے اور مشرقی یروشلم تک کو جوڑنے کا عمل سامنے آتا۔

اسرائیل کے اندر کھڑی کی گئی ۷۰۸ کلومیٹر پر پھیلی کنکریٹ کی دیوار کو اسرائیل گرانے پر آمادہ نظر آتا۔ اسرائیل پس و پیش کرتا تو امریکا کی طرف سے کوئی زبانی کلامی کوشش، کوئی سفارتی حرکت ہی نظر آتی۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ البتہ ایک نجی تعمیراتی کمپنی نے ایک تعمیراتی منصوبہ ضرور پیش کر دیا۔ ایسا منصوبہ جس میں آف شور بندرگاہ سے لے کر ایئرپورٹ اور سڑکوں کے ایک خوبصورت جال کے علاوہ فلک بوس خوبصورت عمارات کا نقشہ تھا۔ امارات کے برج خلیفہ اور سعودی عرب کے مکہ ٹاور کی طرح جسے امارات اور سعودی عرب اپنی شناخت اور ترقی و خوشحالی کی شان کے طور پر دیکھتے ہیں۔

اس 'تفہیم' پر بعد ازاں مئی ۲۰۲۴ء میں نیتن یاہو کے دفتر سے بھی ایک خاکہ سرکاری تصدیق کے بغیر لیک کیا گیا۔ گویا غزہ کو بحر متوسط کے کنارے ٹرمپ کے 'غزہ ریوی ایرا' کے موجودہ تصور کی جڑیں کہیں اور بھی موجود ہیں۔

غزہ ریوی ایرا کا یہ پرت ایسا ہے کہ اس کے اثرات مشرقِ وسطیٰ کے خوشحال ملکوں پر پڑنے کا خدشہ لازمی ہے۔ یہ آج کے دبئی اور کل کے نیوم سٹی کی موجودگی میں امریکا و اسرائیل کی معاشی، سیاحتی، سمندری اور عسکری آشاؤں اور منصوبوں میں رنگ بھرنے کا موجب بنے گا۔

فلسطینیوں سے 'پاک' اس 'غزہ ریوی ایرا' کو تصوراتی اعتبار سے دبئی جیسے پوٹینشل کا حامل سمجھنے کا ایک تازہ اظہار آٹھ مارچ ۲۰۲۵ء کو بھارتی اخبار ''انڈیا ٹوڈے'' میں اسرائیل کی سابق رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر اینات ولف نے کر دیا ہے کہ 'غزہ ریوی ایرا میں دبئی کا پوٹینشل موجود ہے۔'

یہ غزہ ریوی ایرا صرف ڈونلڈ ٹرمپ کے ریزارٹس کے دیرینہ وژن اور دنیا بھر کے امرا کی تفریح گاہ کے لیے ایک ندی کنارا نہ ہو گا بلکہ اس میں ایک اندازے کے مطابق ۱۷ارب بیرل موجود تیل کا خزانہ اور وسیع پیمانے پر موجود شمسی توانائی کے وسائل کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ اہم بحری اڈہ بننے کے سارے امکانات موجود ہیں۔

یہ اہم تر تجارتی راستے سے بھی جڑا ہونے کے ناطے چین کے تجارتی عزائم کی راہ میں بھی رکاوٹ بن سکتا ہے اور مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات اور اسرائیلی تحفظ کی ضمانت بھی۔ اس کی تکمیل کا ابتدائی خواب ۲۰۳۵ء میں دیکھا گیا ہے۔ جبکہ نیوم سٹی ۲۰۳۰ء میں اپنی تکمیل کی کافی منزلیں طے کر چکا ہو گا۔ یہ نیوم کا متبادل بننے کا پوٹینشل رکھتا ہے یا نہیں، فی الحال اس پر ماہرین اور اسرائیلی و امریکی خاموش ہیں!

اب ایک اور پرت دیکھتے ہیں۔ اسرائیل کا جنگ بندی معاہدے کے بعد از سر نو جنگ شروع کرنے کا راستہ اسے کافی منافع بخش نظر آنے کی امید پیدا ہو رہی ہے۔ یہ امید اس کے باوجود لگ رہی ہے کہ کئی یورپی نمائندوں ہی نہیں، خود اسرائیل کے اپنے عسکری ماہرین اور عوام کی بڑی تعداد بھی اسرائیل کے دوبارہ ایک تباہی پھیلانے والی جنگ میں کودنے کو تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ مگر اسرائیل کے لیے اطمینان و راحت انگیز بات یہ ہے کہ امریکا ٹرمپ کی قیادت میں اسرائیل کے لیے ایک بڑے بلکہ سنہرے موقع کی طرح موجود ہے۔

دوسری خوش قسمتی اسرائیل کی یہ ہے کہ اس کے خلاف کہیں سے کوئی بڑی مزاحمت نہیں ہے۔ جو مزاحمتی آواز مسلم دنیا یا عرب ملکوں کی طرف سے اٹھتی ہیں، وہ اٹھتے ہی ڈوب جانے اور صدا بصحرا ہونے کا خوب پوٹینشل رکھتی ہیں۔ یہ خوش قسمتی اسرائیل کی اس لیے بھی ہے کہ عرب و مسلم دنیا کی ساخت و حکمت اس کے بنیادی عناصر ترکیبی اور گھٹی میں شامل ہیں کہ یہ ریاستیں جن کی تعداد ۵۰ سے زائد ہے، بہرصورت امن چاہتی ہیں۔

دوسرے سال میں داخل ہو چکی غزہ میں لڑی جانے والی جنگ میں امریکا و اسرائیل کے اس خواب کی تکمیل ہونے کا بڑا امکان ہے کہ غزہ کو فلسطینیوں سے 'پاک' ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں ٹرمپ اور نیتن یاہو کے مشترکہ ہدف میں فوری رنگ بھرنے میں اگر کچھ حکمت کے تقاضے آڑے بھی آ گئے تو وقت ضائع نہ کرنے کی حکمت عملی بروئے کار رہے۔ اس حکمتِ عملی کے تحت نہ صرف یہ کہ ان سارے امدادی اداروں اور امداد و خوراک کی تقسیم کرنے والی تنظیموں کو ناکہ بندی سے روک دیا گیا ہے، جو بے گھر لاکھوں خواتین اور بچوں کو خوراک اور زندگی کی امید دے سکتے ہیں۔

اسرائیل شروع سے خواتین اور خصوصاً حاملہ خواتین کو ترجیحاً قتل کرنے کی حکمت عملی رکھتا ہے۔ اسرائیلی حکمت ساز اور فیصلہ ساز سمجھتے ہیں کہ اس طرح ایک گولی سے دو جانیں بیک وقت لی جاسکتی ہیں۔ ایک بننے والی ماں کی اور پیدا ہونے والے فلسطینی بچے کی۔ فلسطینی شیر خواروں کو دودھ کی فراہمی میں مدد دینے والی این جی اوز کو روکا جانا بھی اس سلسلے کی کڑی اور خیموں میں بسے بچوں اور ان کی ماؤں کو ہدف بنا کر بمباری کرنے کا بھی یہی مقصد ہے، اس میں بلا رکاوٹ کامیابی اسرائیل کے لیے خوش آئند ہے۔

سفارتی میدان میں بھی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کوئی بڑی رکاوٹ نہیں رہی ہے۔ ''ابراہم معاہدے'' کے سلسلے میں پیش رفت کی امید پھر سے توانا ہو رہی ہے۔ متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ کی اپنے اسرائیلی ہم منصب سے حالیہ ملاقات اسرائیل کے لیے حوصلہ افزا اور امریکا کے لیے اطمینان بخش ہے۔ ایران کی عسکری سکت کم ہو گئی ہے۔ شام اور لبنان سے بھی خطرہ نہیں۔

پاکستان سفارتی میدان میں ایک پیروکار ملک کے طور پر کسی ایسی سمت میں جانے کا کوئی اشارہ نہیں دیتا جو اسرائیل کے لیے مشکلات بڑھانے والی ہوں۔ ترکیہ کے اپنے مسائل ہیں۔ ملائیشیا سے کوئی خطرہ نہیں۔ عراق کمزور ہے۔ گویا غزہ جنگ کے سب پرتوں میں اسرائیل کو امید اور امریکا کو میدان آسان نظر آنا فطری ہے۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۹؍اپریل ۲۰۲۵ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

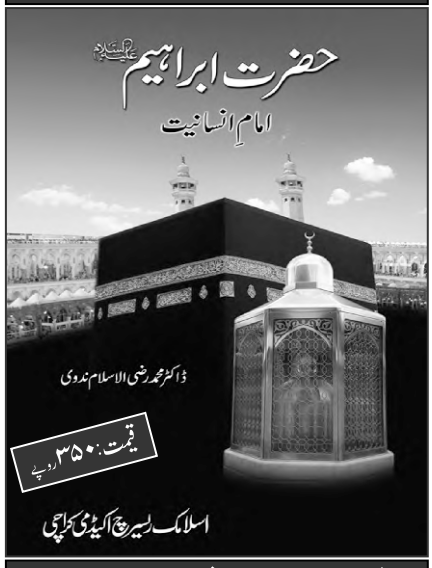

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36368020

برصغیر پاک و ہند کا معروف علمی و تحقیقی رسالہ

سہ ماہی ''تحقیقاتِ اسلامی''

علی گڑھ (بھارت)

فی شمارہ: ۴۰۰ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

تازہ شمارہ حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے

اکیڈمی بُک سینٹر

ڈی-۳۵، بلاک-۵، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

فون: ۰۲۱-۳۶۳۶۸۰۲۰، ۰۳۳۴-۳۹۱۲۷۶۹

بھارتی معیشت: سبیر بھاٹیہ کی گہری گہری باتیں

سبیر بھاٹیہ بھارتی نژاد امریکی ارب پتی آجر ہیں۔ وہ ٹیکنالوجی کی دنیا میں ایک بڑا نام ہیں۔ انہوں نے ۱۹۹۶ء میں ہاٹ میل کے نام سے ای میل سروس شروع کی جو ابتدائی ویب بیسڈ ای میل سروسز میں سے تھی۔ سبیر بھاٹیہ نے بعد میں ہاٹ میل کو مائیکروسوفٹ کے ہاتھوں ۴۰ کروڑ ڈالر میں فروخت کیا۔ سبیر بھاٹیہ ورک کلچر، ٹیکنالوجی، بزنس مینجمنٹ، پرسنل ڈیویلپمنٹ اور دیگر موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے رہتے ہیں۔ اُن کا شمار اُن چند نمایاں کاروباری شخصیات میں ہوتا ہے جو لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی بات کہتے ہیں اور نئی نسل کی رہنمائی کے معاملے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ مذکورہ مضمون معروف امریکی یوٹیوبر ہرنور سنگھ (سان فرانسسکو) کے پوڈ کاسٹ کے اقتباسات پر مبنی ہے۔

سبیر بھاٹیہ کہتے ہیں کہ بھارتی قیادت بہت جلد چین سے آگے نکل جانے کی باتیں کر رہی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی چین کی طرز پر بھارت کو تعمیر نہیں کر سکتی۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ بھارت میں تھیوری پر زور ہے، پریکٹیکل پر نہیں۔ بھارت بھر میں تعلیم و تربیت کا نظام ایسا ہے کہ لوگ فارغ التحصیل ہونے پر بھی عملی دنیا میں بہت دیر سے قدم رکھتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہر طرف ایسے لوگ گھومتے پھرتے ہیں جو جانتے تو بہت کچھ ہیں مگر کچھ کرتے نہیں اور کرنا چاہتے بھی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ ہر شعبے جانکار تو بہت دکھائی دیتے ہیں مگر کام نظر نہیں آتا۔ ضرورت کام کی ہے، نتائج کی ہے۔ اس حوالے سے خالص پروفیشنل اپروچ کی شدید کمی اب شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔

سبیر بھاٹیہ کا کہنا ہے کہ بھارتی حکومت کے اکنامک منیجرز خام قومی پیداوار یعنی جی ڈی پی کے اعداد و شمار کے حوالے سے بھی دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں اور بڑھکیں مارتے ہیں۔ بھارت میں جی ڈی پی کی پیمائش کا طریقِ کار بھی معیاری نہیں۔ اِس سے اِس حقیقت کا علم نہیں ہو پاتا کہ بھارت بھر میں ورک فورس واقعی کس حد تک پیداوار ممکن بنا رہی ہے۔ بھارت کا جی ڈی پی ماڈل بہت ناقص ہے۔ حقیقی معاشی نمو محنت کے نتیجے میں واقع ہوتی ہے نہ کہ صرف مالیات کے لین دین سے۔ سبیر بھاٹیہ نے بھارت میں جی ڈی پی کی پیمائش کے حوالے سے جو کچھ کہا ہے، اُس نے بھارت کے کاروباری حلقوں میں ہلچل مچادی ہے۔ بہت سے حلقے اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ترقی، تگ و دَو اور کامیابی کی نئی اور معقول تصریح کرنے والا مائنڈ سیٹ اپنایا جائے۔ حقیقت پسندی کو گلے لگانے پر زور دیا جارہا ہے۔ سبیر بھاٹیہ نے یہ نکتہ خصوصی طور پر بیان کیا ہے کہ بھارت میں جی ڈی پی کی پیمائش سے یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ ملک کی افرادی قوت درحقیقت کس حد تک کارگر ہے اور کس نوعیت کی کتنی پیداوار یقینی بنا سکتی ہے یا بنا رہی ہے۔ سبیر بھاٹیہ کہتے ہیں کہ بھارت میں اگر کسی کو ایک ہزار روپے دوں اور وہ شخص وہ ہزار روپے کسی اور کو دے دے تو جی ڈی پی میں اِسے دو ہزار روپے گن لیا جاتا ہے جبکہ اس معاملے میں کوئی کام تو ہوا ہی نہیں۔ پیسہ دینا کام کرنا نہیں ہے۔ حقیقی کام تو صرف وہ کام ہے جو کیا جائے اور جس کے نتیجے میں کچھ پیدا ہو یا کسی کی خدمت انجام دی جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون کتنے گھنٹے کام کرتا ہے اور اُس کے کیے ہوئے کام کے نتیجے میں پیدا کیا ہوتا ہے۔

سبیر بھاٹیہ کے مطابق بھارت سمیت ایشیا کے بہت سے ممالک میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ فی گھنٹہ اجرت طے کرنے کا نظام شاید غیر ہنرمند افراد کے لیے ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ امریکا اور یورپ میں ڈاکٹرز، انجینئرز، مصنفین، ایڈیٹرز، وائس آرٹسٹ اور دیگر بہت سے پروفیشنل کی خدمات بھی گھنٹہ وار اجرت کی بنیاد پر حاصل کی جاتی ہیں۔ جو بھی کوئی نتیجہ پیدا کر پاتا ہے، اُسی کو اجرت ملتی ہے۔ ڈاکٹرز کے لیے بھی زیادہ آمدنی کی گنجائش اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب اُن سے علاج کرانے والے صحت یاب ہوں۔ نتائج پیدا نہ کر پانے کی صورت میں ڈاکٹر سمیت تمام پروفیشنل کے لیے زیادہ کمانا ممکن نہیں ہو پاتا۔

سبیر بھاٹیہ کے خیال میں بھارت میں گھنٹے کی بنیاد پر اجرت دینے کا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ امریکا میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس نے کتنے گھنٹے کام کیا ہے۔ اِسی کی بنیاد پر اجرت بھی طے ہوتی ہے اور جی ڈی پی بھی۔ بھارت میں اب تک یہ واضح نہیں کہ اجرت کس بنیاد پر طے کی جاتی ہے۔ لوگ محض حاضری لگا کر بیٹھے رہتے ہیں اور اجرت کے حق دار قرار پاتے ہیں۔ امریکا میں اگر کوئی کسی کو چار گھنٹے کے لیے رکھتا ہے تو یہ دیکھتا ہے کہ چار گھنٹے میں اُس نے کتنا کام کیا ہے، کون سی تبدیلی یقینی بنائی ہے۔ امریکا میں مستقل نوعیت کی ملازمت کا تصور ناپید ہوتا جارہا ہے۔ بہت سے اسٹور کے لیے باہر بورڈ لگا ہوتا ہے کہ تین گھنٹے کے لیے لیبر کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی اپنی خدمات پیش کرے تو فی گھنٹہ اجرت طے کرکے اُسے کام پر لگادیا جاتا ہے اور تین گھنٹے میں کام ختم ہوتے ہی اُسے فارغ کردیا جاتا ہے۔ یورپ میں بھی کچھ ایسا ہی نظام ہے۔ وہ لوگ بھی یہ دیکھتے ہیں کہ جسے کام پر لگایا گیا ہے، اُس نے کتنا کام کیا ہے اور اُس کی خدمات حاصل کرنے سے کوئی نتیجہ بھی برآمد ہوا ہے یا نہیں۔

سبیر بھاٹیہ کا کہنا ہے کہ بھارت میں اُن لوگوں کو بھی احترام مل رہا ہے جو ملک میں کچھ کرنے کے بجائے بیشتر معاملات کو کسی نہ کسی طور اور کسی نہ کسی سطح پر آؤٹ سورس کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے میں یہ توقع کس قدر فضول ہے کہ چین کی طرح بھرپور تعمیر و ترقی ممکن بنائی جاسکے گی۔ ملک کو زیادہ سے زیادہ جدت و ندرت کی ضرورت ہے۔ ملک بھر میں مہارتوں کی شدید کمی ہے۔ تخلیقی سوچ کا فقدان ہے۔ لوگ نقالی پر گزارا کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ملک کی تعمیر و ترقی میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کرسکتا۔ ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ لوگ جو تعلیم و تربیت پاتے ہیں، اُس سے مطابقت رکھنے والے کام نہیں کرتے۔ مثلاً بیشتر انجینئر کو پوری تعلیم و تربیت اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ میدان میں آکر تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں مگر وہ بالآخر انتظامی نوعیت کے عہدوں تک محدود ہوکر رہ جاتے ہیں۔ کیا انجینئرز اس لیے تیار کیے جاتے ہیں کہ دفاتر تک محدود ہوکر رہ جائیں؟ یقیناً نہیں۔ دنیا بھر میں لوگ عمل کی دنیا میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ حقیقی مطلوب نتائج تو اِسی طور پیدا ہوتے ہیں۔ انجینئر اس لیے ہوتے ہیں کہ عملی سطح پر متحرک رہتے ہوئے بہت کچھ تعمیر کریں، بنائیں، مضبوط کریں۔ بھارت میں اس سوچ کے ساتھ کام کرنے کا بھی رواج عام نہیں اور اِس سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ جدت اور ندرت کے بارے میں فکرمند رہنے والوں کی بھی شدید کمی ہے۔ دنیا اب آن لائن کلچر کی طرف چلی گئی ہے۔ بھارت میں آج بھی ہاتھ سے کام کرنے والوں کو زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سوفٹ ویئرز کی مدد سے کام کرنے والوں کا وہ مقام نہیں جو ہونا چاہیے۔ ایسے میں یہ بات انتہائی حیرت

انگیز ہے کہ بھارت کو سوفٹ ویئر گرو کہا جاتا ہے جبکہ لوگ ہاتھ سے کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

سیبر بھاٹیہ کہتے ہیں کہ بھارت کو اپنا ورک کلچر مکمل طور پر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ تکنیکی مہارتوں کے حوالے سے بھی نئی سوچ اپنانا لازم ہے۔ لازم ہے کہ ورک کلچر تبدیل کرتے ہوئے ہر اُس انسان کو احترام کی نظر سے دیکھنا شروع کیا جائے جو عمل کی دنیا میں زیادہ سے زیادہ رہنا چاہتا ہے۔ دنیا بھر میں تسلیم شدہ ورک کلچر یہ ہے کہ ہر محنت کرنے والے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تعلیمی نظام بھی بدلنا پڑے گا۔ جو لوگ تحقیق کرتے ہیں، سوفٹ ویئر تیار کرتے ہیں، اُن کا زیادہ احترام کیا جانا چاہیے۔ تخلیقی سوچ اپنانے والوں کی قدر دانی ہونی چاہیے۔

سیبر بھاٹیہ کہتے ہیں کہ چین میں اس بات کی بہت اہمیت ہے کہ تعلیم سب کے لیے ہونی چاہیے اور تربیت بھی۔ معاشرے کے کسی بھی طبقے کو علم کے بغیر رہنے نہیں دیا جاتا۔ تعلیم کے معاملے میں ریاست اپنی ذمہ داری محسوس کرتی ہے۔ تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزرنے والوں کو کام کے مواقع بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔ بھارت میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ تعلیم دولت مندوں کے لیے مختص ہو کر رہ گئی ہے۔ تعلیم ہے ہی اتنی مہنگی کہ غریب کا بچہ تو ڈھنگ سے پڑھ ہی نہیں پاتا اور امیروں کے بچے بھی پڑھ لکھ کر کون سے تیر مار لیتے ہیں۔ لڑکیوں کا یہ حال ہے کہ ڈگریاں لینے کے بعد شادی کر لیتی ہیں، بس۔ یہ بھونڈا پن کب تک جاری رہے گا؟ یہ سوچ کب بدلے گی؟ سیبر بھاٹیہ کہتے ہیں کہ تعلیم و تربیت قومی تعمیر و ترقی کے لیے ہوتی ہے۔ اگر کسی لڑکی کو شادی کر کے گھر ہی بسانا ہے اور گھر ہی سنبھالنا ہے تو پھر اُسے اعلیٰ اور پیشہ ورانہ تعلیم نہ دلوائی جائے۔ خصوصی تعلیم پر والدین کا بھی بہت کچھ خرچ ہوتا ہے اور معاشرے کا بھی۔ ریاست بہت سے اداروں کو امداد فراہم کرتی ہے تب کہیں وہ اعلیٰ تعلیم دینے کے قابل ہو پاتے ہیں۔ ایسے اداروں سے پڑھ لکھ کر اگر لوگ مطابقت رکھنے والا کام نہ کریں تو یہی سمجھا جائے گا کہ ساری محنت اکارت گئی۔

سیبر بھاٹیہ کہتے ہیں کہ بھارتی سماج کا ڈھانچا ایسا ہے کہ لوگ اشتراکِ عمل سے دور رہتے ہیں۔ ذات پات کا نظام اب تک برقرار ہے۔ پورے بھارت میں فزیکل انفرااسٹرکچر کو راتوں رات تبدیل کرنا یا تعمیر کرنا انتہائی دشوار ہے۔ اس سلسلے میں ڈیجیٹل ٹولز بہت کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔ بھارت کے تعلیم یافتہ افراد کو عملی زندگی میں زیادہ سے زیادہ اشتراکِ عمل سکھانے کی ضرورت ہے۔ نئی نسل کو بتایا جائے کہ محض مسابقت سے نہیں بلکہ اشتراکِ عمل سے بھی ترقی کا عمل تیز کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کر کے یا ایک دوسرے کی معاونت پا کر بھی بہت کچھ سیکھا اور کیا جا سکتا ہے۔ خوشی صرف اپنی کامیابی کا نام نہیں ہے۔ کبھی کبھی کسی کی مدد کر کے، اُسے کامیابی سے ہمکنار کر کے بھی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں لوگ انفرادی سطح پر ایسے ہی اکنامک ماڈل کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ امریکا اور یورپ کے بیشتر کاروباری ادارے چاہتے ہیں کہ اُن کے ملازمین ایک دوسرے کو نیچا دکھانے یا ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی تگ و دَو کرنے کے بجائے مل کر کام کریں، ایک دوسرے کی صلاحیت و سکت سے مستفید ہوں تاکہ حتمی تجزیے میں ادارے کو حقیقی فائدہ پہنچے۔

مسابقت دنیا بھر میں ہوتی ہے مگر صرف مسابقت نہیں ہوتی، اشتراکِ عمل کا ماڈل بھی کارگر رہتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔ ترقی یافتہ معاشروں کا یہی چلن ہے۔ وہاں ترقی کا مطلب دوسروں کی قبور پر اپنا تاج محل تعمیر کرنا نہیں ہے۔ لوگ دن رات ایک کر کے کامیاب ہوتے ہیں تو دوسروں کو بھی کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں اور اِس معاملے میں اُن کی رہنمائی کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔

سیبر بھاٹیہ کہتے ہیں کہ مغربی ممالک میں بھی تمام تعلیمی یکساں معیار کے نہیں۔ بہت سے ادارے کمزور ہیں مگر ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔ امریکا کی اسٹینفرڈ یونیورسٹی وہ بتاتی اور سکھاتی ہے جو اس وقت ہے یعنی کام کی باتوں پر متوجہ رہتی ہے جبکہ میساچوسیٹس انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے اہلِ علم و فن اب تک ماضی کی بُھول بُھلیوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ مغربی تعلیمی اداروں میں انرولمنٹ کراتے وقت بہت سے معاملات کو دیکھنا چاہیے۔ بعض ادارے ہیں تو بہت نامور مگر وہ شخصیت کی تعمیر میں کچھ خاص کردار ادا نہیں کرتے۔

سیبر بھاٹیہ کا کہنا ہے کہ انٹرنیٹ نعمت ہے جس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جانا چاہیے۔ فی زمانہ انٹرنیٹ بھی بہت کچھ سکھا رہا ہے اور مفت سکھا رہا ہے۔ انٹرنیٹ پر دنیا بھر کا علم موجود ہے۔ اگر کسی کو سرچنگ اور براؤزنگ کا ہنر آتا ہے تو وہ انٹرنیٹ کی مدد سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ ایسا کر رہے ہیں۔ سیبر بھاٹیہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی تعلیمی کارکردگی یعنی سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر امریکی ہائی ٹیک ادارے ایپل میں ملازمت حاصل کی مگر جاب کے دوران میں نے عملی سطح پر جو کچھ سیکھا، اُسے ڈھنگ سے بروئے کار لاتے ہوئے ہاٹ میل کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔ اگر کسی کو جدت اور ندرت کے حوالے سے اپنا نام بنانا ہے، لوگوں سے احترام چاہیے تو عملی سطح پر بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ کام کرنے سے انسان بہت کچھ سیکھتا اور سیکھے ہوئے کو سنوارتا جاتا ہے۔ محض پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا، کرنے سے بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے لوگ اور کاروباری ادارے محض ادارے کی حد تک دی ہوئی تعلیم کو سب کچھ نہیں سمجھتے بلکہ عمل کی دنیا میں زیادہ وقت گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

سیبر بھاٹیہ کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں وہی اقوام ترقی کر پائی ہیں جنہوں نے نئی نسل کو ذمہ داری قبول کرنا سکھایا ہے۔ جو لوگ کسی کے ماتحت رہتے ہوئے کام کرتے ہیں، وہ زیادہ دور تک چل نہیں پاتے۔ لازم ہے کہ انسان کوئی کام اپنے ہاتھ میں لے، اُس کے نتائج کی ذمہ داری قبول کرے اور اپنی صلاحیت و سکت کو بروئے کار لاتے ہوئے بہترین نتائج پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ دنیا بھر میں وہی معاشرے ترقی کرتے ہیں جو نئی نسل پر بھروسا کرتے ہیں، اُسے کام سونپتے ہیں، ذمہ داری قبول کرنا سکھاتے ہیں۔ نئی نسل میں زیادہ سکت ہوتی ہے اور کام کرنے کی لگن بھی معمر نسل سے زیادہ ہوتی ہے۔ تجربے کی کمی کو رہنمائی کے ذریعے پورا کیا جا سکتا ہے۔ امریکا اور یورپ کے اکنامک ماڈل پر اُچٹتی سی نظر دوڑائیے تو اندازہ ہو جائے گا کہ وہاں نئی نسل کی صلاحیت و سکت کو بروئے کار لانے پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ بھارت سمیت بیشتر ایشیائی معاشرے اِس منزل سے بہت دور ہیں۔ یہاں لوگ انفرادی ترقی اور کامیابی پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ ترقی اور کامیابی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسروں کو کامیاب ہوتا دیکھنے کا ظرف ہی نہ پایا جائے۔ قومیں اُسی وقت ترقی کرتی ہیں جب ذاتی نوعیت کی پرخاش اور معاندت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ کام کرنے پر توجہ دی جائے۔

سیبر بھاٹیہ کا استدلال ہے کہ ٹیکنالوجی سے خوف کھانے کی صورت میں قومیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ جب بھی کوئی بڑی ٹیکنالوجی آتی ہے تو چند ایک شعبوں کے لیے مشکلات کھڑی ہوتی ہیں اور بعض شعبے تو جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ٹیکنالوجی کی راہ مسدود کر دی جائے۔ یہ گویا اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہوا۔ چند افراد کا روزگار بچانے کے لیے ٹیکنالوجی کی راہ میں دیواریں کھڑی کرنا قومی

ترقی کی راہیں مسدود کرنا ہے۔ ہر انسان کنٹریکٹ پر ہے۔ کیسا کنٹریکٹ؟ اپنے آپ سے کوئی وعدہ کیا ہوا ہے۔ ہر انسان کو کامیاب ہونا ہے۔ یہی تو اپنے آپ سے وعدہ ہے۔

سیبر بھاٹیہ کا مشورہ ہے کہ مصنوعی ذہانت کو پوری توجہ اور لگن سے بروئے کار لائیے۔ ہم ایسے عہد میں جی رہے ہیں جس میں اپنے ذہن پر بہت زیادہ زور ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ ذہن کو زحمت سے بچانے کے لیے مصنوعی ذہانت تیار کی گئی ہے تاکہ کام میں آسانی ہو۔ ہر انسان کو اپنے طور پر فیصلہ کرنا ہے کہ کرنا کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کام کیجیے اور اپنے آپ ہی کو رپورٹ کیجیے۔ دیانت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

سیبر بھاٹیہ کے خیال میں نئی نسل کے لیے نئی ٹیکنالوجی میں زیادہ سے زیادہ مہارت حاصل کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ اگر وہ ٹیکنالوجی میں ہونے والی پیشرفت کو نظر انداز کرے گی تو اپنے پیروں پر کلہاڑی مارے گی۔ دنیا بھر میں وہی اقوام کچھ کر پا رہی ہیں جو نئی ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہو کر چل رہی ہیں۔ اس وقت کسی بھی ٹیکنالوجی کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ماحول ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ سب کے ساتھ مل کر چلنے کے سوا چارہ نہیں۔ جو معاشرہ الگ تھلگ رہنا چاہتا ہے، وہ بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

سیبر بھاٹیہ کو بھارت میں کام کرنے کے ماحول اور کام سے متعلق اخلاقیات کے بارے میں بہت سے تحفظات ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بھارت نے ابھی تک کام کرنے کے حقیقی ماحول کو گلے نہیں لگایا۔ لوگ سوچے سمجھے بغیر جی رہے ہیں۔ زندگی بھر کے لیے منصوبہ سازی کا فقدان ہے۔ واضح روڈ میپ طے کیے بغیر کام ہو رہا ہے۔ اکثریت گزارے کی سطح پر جی رہی ہے۔ ذہنیت یہ ہے کہ بس کسی طور دن گزر جائے، کل کی کل دیکھی جائے گی۔

بھارت سمیت کسی بھی ملک کو اگر چین سے مقابلہ کرنا ہے تو وہی ورک ایتھکس اپنانا پڑیں گی جو چین میں مستعمل ہیں۔ چین میں کام کرنے والوں کی قدر ہے۔ نئی نسل کو اوّلیت دی جاتی ہے۔ ذہین اور مستعد نوجوانوں کو آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ اگر بھارت کو طویل المیعاد بنیاد پر چین کے سامنے کھڑا ہونا ہے تو لازم ہے کہ کام کے ماحول میں موزوں ترین تبدیلیوں کی راہ ہموار کی جائے۔ چین میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پروفیشنل تربیت یافتہ افراد کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اُن کی صلاحیتوں سے مستفید ہونے کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔

چین میں اس بات کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ جس نے جس شعبے میں تعلیم و تربیت پائی ہے، اُسے اُسی شعبے میں کام کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ بھارت میں آج بھی لاکھوں نوجوان اپنے اپنے شعبوں سے ہٹ کر کام کر رہے ہیں اور جو اپنے شعبے میں ہیں، وہ بھی وہ کام نہیں کر پا رہے جس کے لیے انہوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ بہت سے شعبے ایسے ہیں جو عملی نوعیت کے ہیں۔ انجینئرز اس لیے ہوتے ہیں کہ میدان میں نکلیں، کچھ بنائیں، کچھ کر کے دکھائیں۔ ہمارے ہاں کا ورک کلچر ایسا ہے کہ لوگ کچھ کرنے کے بجائے ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں اور سکون سے تنخواہ وصول کرتے رہتے ہیں۔ یہ طریقہ کسی بھی اعتبار سے معقول ہے نہ قابلِ تقلید۔ پروفیشنل تعلیم و تربیت کے حامل افراد سے اُن کی صلاحیت و سکت اور طبیعت کی موزونیت کے لحاظ سے کام لیا جانا چاہیے۔ بیشتر ترقی یافتہ معاشروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ نئی نسل کو اُس کی بھرپور دلچسپی کے شعبے میں آگے بڑھنے کی راہ دی جاتی ہے۔ ملازمت پر اس بات کو ترجیح دی جاتی ہے کہ نئی نسل سے منصوبوں کی سطح پر کام لیا جائے۔ جاب کی بنیاد پر کام لینے کی صورت میں کام زیادہ ہو پاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو پاتا ہے کہ کس نے کس حد تک محنت کی ہے، خود کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔

سیبر بھاٹیہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ تعلیمی نظام اور ورک ایتھکس کو راتوں رات تبدیل نہیں کیا جاسکتا، مگر پھر بھی ڈیجیٹل ٹولز اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ذریعے بہت کچھ بہت تیزی سے کیا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بھارت میں ایسے نوجوانوں کی کمی ہے جو تخلیقی سوچ رکھتے ہوں۔ تخلیقی انداز سے سوچنے کی تربیت بھی کم ہی دی جاتی ہے۔ لوگ نقالی پر چل رہے ہیں۔ جو کچھ مغرب میں چل رہا ہوتا ہے، بس اُسی کو اپنانے میں عافیت سمجھی جاتی ہے۔ تخلیقی سوچ مختلف ایپس کے ذریعے بھی سکھائی جاسکتی ہے۔ تعلیمی اداروں کا بنیادی ڈھانچا بدلنے میں وقت لگے گا مگر تب تک انٹرنیٹ پر موجود میٹریل کی مدد سے نئی نسل کو بہت کچھ دیا اور سکھایا جاسکتا ہے۔ ایسا ماحول پیدا کرنا لازم ہے جس میں لوگ مثبت انداز سے سوچیں، دوسروں سے سیکھنے کی کوشش کریں، دوسروں کو سکھانے پر مائل ہوں اور گلا کاٹ مسابقت کے بجائے ہم آہنگی اور خوش دِلی کے ماحول میں ایک دوسرے کو اپنانے کی کوشش کریں۔

سیبر بھاٹیہ نے پوڈکاسٹ میں کہا ہے کہ مستقبل اُس نسل کا ہے جو ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۷ء کے درمیان پیدا ہوئی ہے۔ یہ جنریشن زی کہلاتی ہے۔ نئی نسل ہی کسی بھی معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ کسی بھی ملک کو ایک نئے عہد میں اُس کی نئی نسل ہی داخل کرتی ہے۔ نئی نسل ہی کوشش کرسکتی ہے اور کرتی ہے۔ نئی نسل ہی کچھ کر دکھانے کا جذبہ رکھتی ہے اور کر دکھاتی ہے۔ بھارت سمیت پورے ایشیا میں نئی نسل پر اُتنی توجہ نہیں دی جاتی جتنی دی جانی چاہیے۔ چین، جنوبی کوریا، جاپان اور تائیوان اِس معاملے میں آف بیٹ ہیں۔ یہ معاشرے نئی نسل کو بنیاد بنا کر چل رہے ہیں۔ ایشیا کے بیشتر پسماندہ معاشروں کا معاملہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے امور پر متوجہ رہتے ہیں مگر نئی نسل کو خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے۔ سوال نئی نسل کو کام کی تحریک دینے کا نہیں بلکہ تحریک دیتے رہنے کا ہے۔ اِس کا ایک معقول و مؤثر طریقہ یہ ہے کہ نئی نسل کو بہتر مواقع فراہم کیے جاتے رہیں، کاروباری دنیا کو اس بات کی تحریک دی جاتی رہے کہ وہ نئی نسل کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے پر متوجہ ہو۔ ہر ترقی یافتہ معاشرے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ معاشرے نئی نسل کے لیے بھرپور تحریک و تحرک کا اہتمام کرتے ہیں۔ جب اس معاملے میں ڈھیل برتی جاتی ہے تب معاملات بگڑنے لگتے ہیں۔

جنریشن زی بہت تیزی سے خود کو بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کرسکتی ہے۔ یہ نسل ہمیں نئے عہد میں لے جائے گی، مستقبل سے ہم آہنگ کرے گی۔ اگر کوئی تبدیلی لانی ہے تو جنریشن زی کے ذریعے ہی لائی جاسکتی ہے اور لائی جانی چاہیے۔

(تلخیص و تدوین: ایم ابراہیم خان)

○○○

بقیہ: برطانیہ: سچ سمجھنا اور بولنا پڑے گا

روا رکھا، وہ سب کی آنکھیں کھولنے اور ہوش کے ناخن لینے کے لیے کافی ہے۔ امریکا صرف اپنا مفاد چاہتا ہے اور اِس کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ یورپ کو یہ حقیقت جلد از جلد سمجھنی ہے اور برطانیہ کو سب سے پہلے۔ دفاع سمیت کسی بھی معاملے میں امریکا پر مکمل بھروسا انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Trump is upending everything". ("The Guardian". March 28, 2025)

○○○

پروفیسر خورشید احمد مرحوم

آصف محمود

پروفیسر خورشید احمد کا سفرِ حیات بھی تمام ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جو جانتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں یہ کون رجلِ رشید تھا جو زمانے سے اٹھا، جو نہیں جانتے وہ مگر شاید اب کبھی نہ جان پائیں۔ یہ کسی فردِ واحد کی کہانی ہوتی تو میں لکھ دیتا، یہ تو ایک مکمل عہد تھا، اسے کوئی کالم میں کیسے سمیٹے۔

یہ ایک فرد نہیں تھا، علم و فکر کا ایک مکتب تھا۔ قدیم برطانوی زمانوں کی روایت تھی، بادشاہ کے مرنے پر اعلان ہوتا تھا: بادشاہ مر گیا، بادشاہ کی عمر دراز ہو۔ میرے بس میں ہو تو میں بھی اعلان کروں کہ پروفیسر خورشید احمد مر گیا، خدا پروفیسر خورشید کی عمر دراز کرے۔ پروفیسر خورشید، جو ایک انسان تھا، مر گیا، پروفیسر خورشید جو ایک مکتب اور ادارہ تھا، زمانوں تک سلامت رہے گا۔

پروفیسر صاحب کی سیاست کا تو مجھے علم نہیں، ان کی علمی وجاہت کا البتہ میں شاہد ہوں۔ وہ جب کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو پھر کسی اور کے بولنے کی گنجائش نہیں ہوتی تھی اور جب وہ کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو پھر کسی اور کے لکھنے کی کوئی حاجت نہیں رہتی تھی۔ ان کی گفتگو اور ان کی تحریر مبہوت کر دیتی تھیں۔ میں نوے کی دہائی میں اسلام آباد آیا تو یہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے عروج کا زمانہ تھا۔ پروفیسر خورشید خود اکثر یہاں موجود اور دستیاب ہوتے تھے۔ یہ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ برادرم صبور سید اور جناب ارشاد محمود، دونوں ان وقتوں میں آئی پی ایس سے وابستہ تھے۔ صبور بین الاقوامی یونیورسٹی میں میرے کلاس فیلو تھے۔ بس ان ہی کی وجہ سے میرا آئی پی ایس آنا جانا شروع ہوا۔

یہاں کی لائبریری میں ایک سحر تھا۔ اسٹاف بہت شائستہ اور ہم دردتھا۔ کتابیں پڑھنے کی عادت تو پہلے ہی تھی، آئی پی ایس کے ماحول نے شوق کو آسودہ کر دیا۔ اب ٹھیک سے کچھ یاد نہیں، یہ میری کرگل والی کتاب تھی یا سی ٹی بی ٹی والی، ایک سیمینار ہو رہا تھا۔ اب یہ بھی یاد نہیں وہ مرحوم جنرل حمید گل تھے یا جناب خورشید ندیم، دونوں میں سے ہی کوئی ایک تھا، سیمینار ختم ہوا تو وہ میرا ہاتھ تھامے پروفیسر صاحب کے کمرے میں ساتھ لے گئے، تعارف کرایا اور میں نے کتاب پروفیسر صاحب کو پیش کی۔ پروفیسر صاحب نے کتاب وصول کی، شکریہ ادا کیا، اور پھر بتایا کہ وہ یہ کتاب خرید بھی چکے ہیں اور پڑھ بھی چکے ہیں۔ میرے لیے یہ انتہائی حیرت کی بات تھی۔ کہاں میرے جیسا طالب علم کہاں پروفیسر خورشید۔ لیکن ان کی علمی وسعت دیکھیے، انہوں نے ایک طالب علم کی کتاب بھی خرید کر پڑھ ڈالی۔ لیکن میری حیرت یہاں تمام نہیں ہوئی۔ مجھے ابھی مزید حیران ہونا تھا۔ انہوں نے وہ نسخہ ہمارے سامنے رکھ دیا جو انہوں نے خرید کر پڑھا تھا۔ میں نے ایسے ہی اس کتاب کو کھولا تو اس میں سرخ قلم سے پروف کی غلطیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بھی پروفیسر صاحب نے پڑھتے پڑھتے خود ہی کیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں تمام صفحات دیکھوں اور اپنی اصلاح کروں، لیکن اس محفل میں اپنی ہی کتاب کی ورق گردانی حدادب کی خلاف ورزی ہوتی۔ میں نے کتاب رکھ دی۔ باہر آ کر ایک صاحب سے درخواست کی کہ پروفیسر صاحب کے کمرے میں میری جو کتاب پڑی ہے، جس پر انہوں نے قلم سے کچھ غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اگر تھوڑی دیر کے لیے وہ کتاب مجھے دے دیں تو عین نوازش ہوگی۔ وہ صاحب آئی پی ایس میں ہی ہوتے تھے۔ چند روز بعد میں آئی پی ایس کی لائبریری گیا تو وہ صاحب مجھے لے کر پروفیسر صاحب کے کمرے کی طرف چل دیے۔ میں نے سوچا، اچھا موقع ہے، پروفیسر صاحب شاید دفتر نہیں آئے، تو وہیں کھڑے کھڑے کتاب کی ورق گردانی کر کے غلطیاں نوٹ کر لوں گا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو حیرت کا ایک جہاں سامنے تھا۔ پروفیسر صاحب سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور انہیں علم بھی تھا کہ میں کیوں آیا ہوں بلکہ یوں کہیے کہ ان کی اجازت سے ہی مجھے وہاں لے جایا گیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ جن صاحب سے میں نے کتاب کی فرمائش کی تھی انہوں نے جا کر پروفیسر صاحب کو ساری بات بتا دی اور پروفیسر صاحب نے کہا انہیں بلا لیں اور میرے پاس لے آئیں۔ اب میں ان کے پاس بیٹھا تھا اور وہ میری اصلاح فرما رہے تھے لیکن انداز ایسا تھا کہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا یہ اصلاح ہو رہی ہے۔ سالوں میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ تو صرف تحسین کر رہے تھے۔ پروفیسر صاحب سے یوں اہتمام سے تفصیل کے ساتھ میری یہ ایک ہی ملاقات تھی۔ ان کی تحریروں اور تقریروں سے البتہ گہرا رشتہ رہا۔

ترجمان القرآن میں ان کی تحریر کا میں شدت سے انتظار کیا کرتا تھا۔ پھر وقت کا موسم دھیرے دھیرے بدلنے لگا۔ ان کی تحریریں بھی کم ہونا شروع ہو گئیں اور میرے جیسے طالب علم بھی وقت کی ناؤ میں بہتے چلے گئے۔ چند ماہ قبل محترم سلیم منصور خالد صاحب نے واٹس ایپ کیا۔ یہ پروفیسر خورشید صاحب کا ان کے نام ایک نوٹ تھا۔ یہ کشمیر پر میرا ایک انگریزی کالم تھا اور پروفیسر صاحب نے سلیم منصور خالد صاحب کو اس کا اردو ترجمہ شائع کرنے کی ہدایت کی تھی۔ میں کافی دیر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے حیرت زیادہ ہے یا خوشی زیادہ۔ حیرت کہ پروفیسر صاحب عمر کے اس حصے میں علمی اور فکری طور پر اتنے فعال ہیں اور خوشی وہی جو ایک طالب علم کو استاد سے پزیرائی پر فطری طور پر ہوتی ہے۔ علمی وجاہت تو تھی ہی پروفیسر صاحب کی پارلیمانی زندگی میں رہنما حیثیت کی حامل رہی۔ ایوان میں کسی بھی مسئلے پر جب وہ بات کرتے تھے تو گویا اس موضوع پر مقطع ہوتا تھا۔ پارلیمانی قواعد وضوابط پر بھی جو گرفت ان کو تھی شاید ہی کسی اور کو ہو۔

ایک بار چوہدری شجاعت حسین صاحب نے بطور وزیر داخلہ ایوان میں کوئی بل پیش کیا، پروفیسر خورشید صاحب نے ایک تکنیکی اعتراض کر دیا کہ یہ قواعد کے مطابق پیش نہیں کیا گیا۔ چوہدری شجاعت حسین صاحب کو وہ بل دوبارہ پیش کرنا پڑا۔ پروفیسر صاحب نے کہا اس بار بھی قواعد کے مطابق پیش نہیں کیا گیا۔ چوہدری صاحب نے تیسری بار کوشش کی اور پروفیسر صاحب نے اس پر بھی یہی اعتراض کر دیا۔ چوہدری شجاعت حسین کے پاس اب کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ کیا کریں۔ وہ چوتھی بار اٹھے اور مسکرا کر کہا: جناب چیئرمین سینیٹ، میں بل کو ایک بار پھر پیش کرتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ اس مرتبہ یوں سمجھا جائے کہ یہ بل اسی طرح پیش کیا جا رہا ہے جیسے پروفیسر صاحب چاہتے ہیں۔ سارے ایوان میں قہقہہ پھوٹ پڑا اور چیئرمین سینیٹ نے کہا: یہ بل اب چونکہ اسی طرح پیش کیا گیا جیسے پروفیسر صاحب چاہتے ہیں اس لیے اب یہ بالکل درست ہے۔ خدا ان کی قبر کو منور فرمائے، ہماری سیاست میں اب کوئی ان جیسا کوئی صاحب علم باقی نہیں ہے۔ وہ اس تہذیبی سفر کی آخری نشانیوں میں سے ایک تھے۔

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۱۵ اپریل ۲۰۲۵ء)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950